

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188370

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۶۵۱ Accession No. ۵۶۲۱

Author. ج. ۱ - عبد الرحمن بن عیسیٰ - ج. ۲

Title مشہور عالم

This book should be returned on or before the date last marked below.

جلد حقوق محفوظ

مشائیر عالم

حصہ اول

طبقة حکماء

مؤلفہ

مولوی عبد اللہ خاں سابق سیکرٹری ماسٹر
نٹرل ہاؤس سکول لاہور

۱۹۱۷ء

نشی رام (سابقہ لکھنؤ) پریس لٹریچر لاہور میں کاشی رام پرنٹر کی اہتمام سے چھپی

مولانا مولوی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای
پریزیڈنٹ کونسل آف ریجنی ریاست بہاولپور
کی

اعلیٰ علمی لیاقت کا شہرہ زباں زوہر خاص عام ہے

اور

جو قد بردانی اور حوصلہ افزائی جناب مدوح

اہل تصنیف و تالیف کی فرماتے ہیں وہ

محتاج بیان نہیں

خاکسار مؤلف

اس ناچیز کتاب کو جناب والا کی خدمت میں

محقر تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

عبد اللہ خاں

ویساج

دنیا کے مشہور اور برگزیدہ آدمیوں کی زندگی کے حالات پڑھنے سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ لوگ اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی زندہ مثال ہیں۔ اور جب ان کے حالات ہم غور سے پڑھتے ہیں تو بے اختیار دل یہی چاہتا ہے کہ کاش ہم میں بھی یہی اوصاف ہوتے۔ پڑھنے والے کے دل میں اس اُسنگ کا پیدا ہونا۔ اور ان لوگوں کی تقلید کے لئے دل کا مائل ہونا اس بات کا کتنی ثبوت ہے کہ شاہراہ زندگی کی کٹھن منزل میں ان برگزیدہ اشخاص کی زندگی کے حالات چراغ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ اور ڈانوا ڈول طبیعت کو راہ راست پر لاتے ہیں۔

ان فوائد کو مد نظر رکھ کر میں نے یہ ارادہ رکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً ہر طبقہ کے مشہور اور ممتاز اشخاص کے مختصر مختصر حالات مرتب کر کے شائع کروں۔ یہ کتاب جو اب شائع کی جاتی ہے اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔ اگر پبلک نے کچھ قدر دانی فرمائی تو اس کے اور حصے بھی یکے بعد دیگرے شائع کئے جائیں گے۔

عبد اللہ خاں

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	نام	صفحہ نمبر	نام	صفحہ نمبر
۱۵۱	امام فخرالدین رازی	۱۳	۱	فیتا غورٹ
۱۵۹	نصیرالدین طوسی	۱۴	۱۱	سقراط
۱۷۷	فیض	۱۵	۳۰	افلاطون
۱۹۱	کرشن	۱۶	۳۵	ارسطو
۲۱۷	کنفوشیٹس	۱۷	۴۶	ابو نصر قابلی
۲۳۵	بہدہ	۱۸	۵۸	ابو ریحان بیرونی
۲۵۹	شکر اچارج	۱۹	۶۹	بوعلی سینا
۲۶۸	کبیر	۲۰	۱۰۱	ابن حزم
۲۷۷	بابا نانک	۲۱	۱۰۵	ناصر خسرو اصفہانی
۲۸۷	بیکن	۲۲	۱۲۰	امام غزالی
۳۱۰	نیوٹن	۲۳	۱۳۲	عمر خیام
			۱۴۰	ابن رشد

مشاہیر عالم

حصہ اول - طبقہ حکماء

فیثا غورث

پیتھیا گورپاس - اور پیتھیا گورپا فیثا غورث کے یونانی نام ہیں۔ ولادت کا وقت اور مقام ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ وہ ۶۶۵ء اور ۶۵۰ء قبل مسیح کے مابین تھا۔ کیونکہ وہ حکیم بندقیس کے کچھ ہی زمانہ بعد پیدا ہوئے ہیں۔

اس نے طلب علم کے شوق میں ملک مصر کا سفر کیا۔ اور وہاں حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے شاگردوں سے جو ملک شام سے مصر میں آ رہے تھے۔ فن حکمت کی تحصیل کی۔ اور خاص حکماء مصر سے علم ہندسہ اور علم طبیعیات کی تعلیم پائی۔ تحصیل علم سے فراغت پا کر وہ یونان میں واپس آیا اور اپنے ہموطنوں میں علوم طبیعیات - ہندسہ - اور علم دین کی

اشاعت شروع کی۔ علم موسیقی اور راگ فیثا غورث ہی کی ایجاد ہے۔ معاود اور مابعد الطبیعت کے بارے میں اس کی رائے کچھ بندقلیس کے خیالات سے ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ فیثا غورث مانتا تھا کہ اس عالم طبیعت سے بالاتر ایک اور روشن عالم ہے۔ جس کے حسن و خوبی کا ادراک مادی عقل کو نہیں ہوتا۔ بلکہ پاک و صاف نفوس ہی کچھ اُس عالم کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اور جو انسان اپنی طبیعت کو غرور، خود پسندی، مکر، حسد، اور دیگر جسمانی خواہشوں سے پاک و صاف بنائے وہ روحانی دنیا میں دخل پانے کے قابل ہوتا ہے۔ اُس کو حکمت الہیات پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ اور پھر اُس کو ایسی روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں جیسے کہ باقاعدہ راگ اور سر سے کان کے پردوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہونے کا مزہ۔

فیثا غورث ایک خاص ترکیب کی غذا تیار کرتا تھا جس کے کھانے سے بھوک پیاس عرصے تک معلوم نہ ہوتی۔ اس کی طبیعت سچا لطیف واقع ہوئی تھی۔ رنج و خوشی دونو حالتوں میں اعتدال کا پابند رہتا تھا۔ نہ زیادہ غم کو دل میں جگہ دیتا نہ زیادہ خوشی کو۔ کسی نے اُس کو کبھی روتے اور ہنستے نہیں دیکھا اس کا قاعدہ تھا کہ اپنے ہم جنس بھائیوں کے فوائد اپنی ذات کے فائدوں سے مقدم رکھتا۔ تندرستوں کے حفظانِ صحت اور بیماروں کے علاج کا بہت خیال

رکھتا تھا۔ اکثر بیماریوں کا علاج مسمریزم کے ذریعے سے کرتا تھا اور بعض حالتوں میں بیماریوں کو روحانی راگوں سے تندرست کر دیتا۔ فیثا غورث کا قول تھا کہ ”امانت داری کچھ مال ہی پر منحصر نہیں بلکہ بات کے بھی امانت دار رہو اور وعدہ کے سچے بنو“

فیثا غورث کا باپ منیسار غورث شہر صور کا رہنے والا تھا۔ اس کے دو بھائی اور بھی تھے۔ سب سے بڑے کا نام اونوسطوس۔ اور دوسرے کا طورنیوس تھا۔ فیثا غورث کی ماں جزیرہ ساموس کے ایک معزز باشندہ اجتابوس کی بیٹی تھی۔ اور اس کا نام پوتھائیس تھا۔ شہر صور پر یمنون۔ یمقرون۔ اور وسقورون نامی تین قبائل نے قبضہ کر کے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اور اس شہر کے اصلی باشندوں کو نکال باہر کیا تو فیثا غورث کا باپ بھی وہاں سے ترک وطن کر کے البحرہ میں جا رہا۔ پھر البحرہ سے ساموس چلا گیا۔ تاکہ وہاں روزی کمائے۔ ساموس میں اس نے قیام کر کے عزت اور اقتدار حاصل کیا۔ پھر وہ انطالیا کو گیا اور فیثا غورث کو بھی سیر و تفریح کرانے کے خیال سے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ وہ کچھ دن انطالیا میں بسر کر کے پھر ساموس واپس آ گیا۔ ساموس میں فیثا غورث نے خاص عزت اور ہر دلچیزی حاصل کر لی تھی۔ وہ دربار رس بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے ساموس کے

امیر اندروقلوس نے فیثاغورث کو اپنا لے پالک بنا لیا اور اس کی پرورش و پرداخت پر خاص توجہ کی۔ ابتداءً فیثاغورث کو ابتدائی قواعد صرت و نحو اور زبان دانی کی۔ پھر ادب۔ لغت۔ اخلاق و آداب اور موسیقی کی تعلیم دی گئی۔ اور اس تعلیم کا تکملہ ہونے کے بعد اندروقلوس نے فیثاغورث کو ہونہار سچہ پاسکر مقام میلیطون میں حکیم انکسیمندر کے پاس طلب علم کے لئے بھیج دیا۔ یہاں فیثاغورث نے علم نجوم۔ اور مساحت و ہندسہ کی تکمیل کی۔ اور ان دنوں فنون میں ماہر ہو چکا تو اب علم رکا ذوق اُسے مختلف شہروں اور ملکوں میں لے گیا۔ ہر جگہ سے اُس نے کچھ نہ کچھ فیض اٹھایا۔ کلدان اور مصر والوں کے کاہنوں سے انکے علوم سیکھے۔ اور یہی سبب تھا کہ فیثاغورث کی حکمت بہت مشہور اور اعلیٰ درجہ کی ہو گئی۔ اس کے بیان میں اثر تھا۔ اور وہ دوسروں کو اپنی جادو اثر تقریر کا مداح ہی نہیں بناتا۔ بلکہ اُن سے جو کام لینا چاہتا اپنی تقریر کے ذریعے لے لیتا تھا۔ مخلوق خدا کو اس حکیم کی ہدایت و تلقین سے بڑا فیض پہنچا۔ اس نے بہت سی قوموں اور جماعتوں کے بگڑے ہوئے اخلاق سدھارے اور گمراہوں کو رہ پر لایا۔ فیثاغورث کو مصر کے کاہنوں کا حال اور کماں معلوم ہوا تو اُس نے اپنے وطن کے فرمانروا کا خط حکمران مصر کے نام حاصل کیا

اور شاہ مصر کی سفارش سے کاہنوں کے پاس پہنچا۔ پہلے وہ شہر الشمس کی ہیکل میں بھیجا گیا۔ (آجکل یہ مقام "عین الشمس" کہلاتا ہے) مصر کے کاہن غیر ذن کو اپنا علم سکھانے میں سخت بخیل تھے۔ انہوں نے فیثاغورث کو سخت امتحان میں ڈالا۔ مگر وہ اسے شوق کہ فیثاغورث بڑی خوشی سے انکی سختیوں کو جھیل کر امتحان میں پورا اُترا۔ عین الشمس کے کاہنوں نے اس کی روش کو کسی پہلو سے قابل اعتراض نہ پایا تو فیثاغورث کو شہر منفیہ رمنفیس یہ قدیم زمانہ میں مصر کا دار السلطنت رہا تھا، کے کاہنوں کی خدمت میں بھیجا۔ اور وہاں بھی اس کا امتحان مزید سختی کے ساتھ لیا گیا جس میں وہ کامیاب نکلا۔ پھر اخیر درجہ اُسے دیوسبولس کی بڑی ہیکل میں بھیجا گیا اور وہاں بھی اس نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ تین سخت ترین امتحانوں کو جھیل کر فیثاغورث نے اپنے اہل ہونے کا پختہ ثبوت دے دیا۔ اور حجت پوری کر دی تو اب مصری کاہنوں کو یہ عذر کرنے کا موقع نہیں رہا کہ وہ نا اہل ہے۔ اور انہوں نے فیثاغورث کو تعلیم دینا شروع کر دیا۔ فیثاغورث کی نیک چلنی۔ پاک دامنی۔ اور پارسائی پہلے ہی تمام مصر میں شہرت پا چکی تھی اور کاہنوں کی نظر میں وقعت حاصل کرنے سے اب وہ اور بھی نامور ہو گیا۔ شاہ رمیسس نے اس

بات سے خوش ہو کر کہ کاہنوں نے فینا غورث پر
 اعتماد کر لیا ہے۔ اس کو قربانگاہ کا محافظ اور
 قربانی کا مہتمم مقرر کر دیا۔ حالانکہ یہ عمدہ اور مرتبہ
 اس سے پہلے کسی پردیسی کو ہرگز نہیں ملا تھا۔
 مصر سے کہانت کا علم حاصل کر کے فینا غورث
 پھر اپنے وطن میں واپس آیا اور ساموس کا دنیاوی
 حاکم اور دینی پیشوا بنا۔ لیکن اس کی طبیعت اس
 منصب کو پسند نہ کر سکی۔ لہذا کچھ عرصہ کے بعد
 دوبارہ سیاحت اور سیر کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 شاگردوں کی جماعت ساتھ تھی۔ ایک جگہ سے دوسری
 جگہ ہاتا اور وعظ و نصیحت کیا کرتا۔ شہر سیرس
 میں اس کی بہت توقیر ہوئی۔ اہل شہر نے ایک
 مکان فینا غورث کے درس دینے کے لئے بنوا دیا۔
 حکیم فینا غورث کی ناصحانہ تقریر نہ صرف شہر سیرس
 کے ہی زن و مرد سننے بلکہ دور دور کے حکمران
 اور امرا اس کی صحبت سے فیض اٹھانے کی تمنا
 میں آیا کرتے۔ ایک دن قروطونیا کا ایک دولتمند
 قولون نامی جو سخت مغرور اور کینہہ طبیعت تھا۔
 حکیم فینا غورث کی مجلس میں آ کر اپنی تعریف
 خود کرنے لگا۔ حکیم نے اس کو فہمائش کی کہ یہ
 بُری بات ہے۔ اپنے منہ اپنی ہی تعریف اخلاق
 و انسانیت کے خلاف ہے۔ قولون کو حکیم کی سچی
 نصیحت سخت ناگوار ہوئی اور وہ کھیانا ہو کر مجلس

سے چلا گیا۔ لیکن اپنے دوستوں میں پہنچ کر اُن کو
 فیثا غورثہ کے خلاف بھڑکایا اور کہا کہ یہ حکیم کافر
 ہے اور اُس کا قتل واجب۔ چنانچہ بد معاشوں کے
 ایک گروہ کو لے کر حکیم کے مکان پر حملہ آور ہوا۔
 شہر والوں نے حکیم کو بچانا چاہا اور اس کو شمش
 میں لٹائی ہو پڑی۔ چالیس آدمی حکیم کے طرفداروں
 میں سے مقتول ہوئے۔ اور رات کو اہل شہر نے
 حکیم کو خفیہ طور پر شہر سے نکال دیا۔ اور دوسری جگہ
 پناہ دیا۔ خاص خاص شاگرد حکیم کے ساتھ تھے۔ لیکن
 جہاں وہاں جاتا قولوں کی شرارت کے خون سے اس
 کو کوئی پناہ نہ دیتا۔ آخر کار وہ ایک ہیکل (مندر)
 میں روپوش ہوا جو نہایت مستحکم عمارت تھی۔
 قولوں کے آدمیوں نے اُس کا محاصرہ کر لیا۔
 چالیس دن تک حکیم اور اُس کے شاگردوں کو غذا
 نہیں ملی اور ان کی قوتیں بالکل سلب ہو گئیں۔
 محاصرہ کرنے والوں نے دیکھا کہ حکیم پر یوں قابو
 نہیں چل سکتا تو اُن سنگ دل اور بے رحم ظالموں
 نے مندر کے گرد لکڑی کے انبار لگا کر آگ دے
 دی اور مکان جلنے لگا۔ جاں نثار شاگرد حکیم کو حلقہ
 میں لے کر بیٹھ گئے۔ تاکہ اپنی جانیں نذا کریں
 اور استاد حکیم کو آج نہ لگنے دیں۔ مگر آگ کی
 تیزی اور دھوئیں کی شدت نے اُن سب کو بیہوش
 کر دیا اور حکیم بھی غش کھا کر گرا اور رگرتے ہی

جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ عمارت میں آگ پوری طرح اثر کر چکی تھی وہ ہر جگہ پھیل گئی اور حکیم کے باقی ماندہ شاگرد جو چارپیس کے قریب تھے اس کی لپٹ میں جل کر خاک ہو گئے۔

حکیم فیثاغورث نے ۴۸۰ کتابیں تصنیف کیں اور بہت سے طالب علم اپنی یادگار چھوڑے۔ اس کے حکمت آمیز اقوال بکثرت ہیں۔ اُن میں سے دو چار یہاں لکھے جاتے ہیں۔ (۱) ”جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے ویسے ہی یہ پھر خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر بھی جائیگا“ (۲) ”مال حاصل کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ حلال طریقہ سے کماؤ اور بائز طور پر خرچ کرو“ (۳) ”اپنی تندرستی کا خیال رکھو۔ اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ کھانے، پینے، اور صحبت کرنے، میں اعتدال کی پابندی کرو اور ورزش جسمانی سے غافل نہ ہو“ (۴) ”دوست کا مال دوست کے لئے حلال ہے“ (۵) ”خدا تعالیٰ حکماء کے فعل دیکھتا ہے اُن کے قول کو معتبر نہیں مانتا“ (۶) ”اچھی چیزیں جو خدا تعالیٰ کو پسند ہیں وہ عمل سے ہاتھ آتی ہیں نہ کہ بانیں بنانے سے“۔

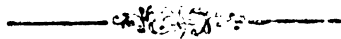
فیثاغورث کی تصانیف جو اس وقت موجود ہیں حسب ذیل ہیں :- (۱) کتاب ارتھمیتک (۲) کتاب الاواج (۳) کتاب در بیان نوم و یلقظہ

(خواب و بیداری) (۴) ”کتاب در بیان کیفیت نفس و جسم“ (۵) ”سلسلی کے سرکش کے نام ایک رسالہ۔“ (۶) ”رسالہ ذہنیہ (سُئرا) اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کلینم ہالینوس اس رسالہ کو سُئری حُرُوف میں لکھا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس رسالہ کی بہت کچھ عزت و عظمت کرتا اور ہمیشہ اس کو پڑھتا۔ اور پڑھاتا رہتا۔“ (۷) ”رسالۃ الی سقائس در بیان استخراج معانی۔“ (۸) ”رسالہ در بیان سیاست عقلی“ اور (۸) ایک رسالہ بنام ”سمید و سیوس“۔

جغرافیہ اور علم الارض میں اس کا مسلک و مذہب اوروں سے بالکل جدا ہے۔ بلکہ وہ فیثاغوری حکما کا لیڈر مانا جاتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے زمین کو متحرک مانا۔ البتہ یہ نہیں بتایا کہ وہ کتاب کے گرد گردش کرتی ہے۔ فیثاغورث ہی نے بتایا کہ صبح و شام کا ستارہ ایک ہی چیز ہے۔ اس نے جا بجا زمین کے اندر اور خشکی میں سمندر کے گھونگھے دیکھے یہ رائے قائم کی کہ جن مقامات میں یہ گھونگھے ملتے ہیں وہاں کسی زمانہ میں سمندر رہا ہوگا۔ چونکہ وہ مصر میں رہا تھا۔ لہذا ممکن ہے کہ دریائے نیل کے دہانہ پر پانی کے ساتھ بہ کر آنے والی مٹی کے ذریعے اس دریا میں ”ٹوٹا“ یعنی مثلث نما زمین بنتی دیکھی ہوگی۔ اور سمندر کے سواحل پر چٹانوں کو کٹ کٹ کر دریا

میں غائب ہوتے معائنہ کیا ہوگا۔ اس بات سے خود اس نے اور اس کے پیرو شاگردوں نے یہ خیال کیا۔ کہ :- (۱) زمین سمندر کی شکل میں بدل جاتی ہے۔ (۲) سمندر زمین کی شکل میں بدل جاتا ہے اس لئے زمین کے اندر اور سمندر سے فاصلے پر سمندر کے گھونگھے نکلتے ہیں۔ (۳) پانی کی روانی اور سیلاب کے بہاؤ سے وادیاں گہری بنتی جاتی ہیں اور ان میں غار پڑ جاتے ہیں۔ پہاڑیاں بھی اُسی سیلاب کے ساتھ بہ جاتی ہیں اور پھر اُن کی جگہ سمندر آ جاتا ہے۔ (۴) ڈلٹاؤں یا نئی مٹی کے اکٹھا ہونے سے جزیروں کی بجائے بڑے اعظم بن گیا ہوگا۔ اور :- (۵) جزیرہ نما زمینیں سمندر کی کاٹ کے ذریعے بڑے عظیم سے الگ ہو کر جزیرے بن گئے ہونگے۔ (۶) بہت سے آباد ملک زلزلوں کی وجہ سے پانی میں غرق ہو گئے۔ جیسے کہ یونان کے شہر ہلیس اور بورس و دونو تہ آب ہو گئے ہیں اور اُن کی شہر پناہ کی دیواریں اب تک سمندر میں نظر آتی ہیں (۷) زمین پر ایسے دریا اور چشمے بھی ہیں جن کا پانی اور چیزوں کو پتھر بنا دیتا ہے۔ اور (۸) آتش فشاں پہاڑوں کے دھانوں کا مقام اور اُن کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ غرضیکہ ان خیالات اور آراء سے پتا چلتا ہے کہ فیثا غورث اور اس کے ہم خیال لوگوں نے قدرت کے انقلاب اور اسرار خلقت کا

پتا لگانے میں بہت کچھ دماغی قوت صرف کی تھی۔ اور گو آج علمی دُنیا کی ترقی کے دور میں اس پر بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ لیکن اُن بے مثال دماغوں کی محنت ضرور قدر اور شکریہ کی نظر سے دیکھنے کے لائق ہے جو ان خیالات کے موجد تھے۔



سقراط

سقراط کا یونانی نام ساکریٹیز - باپ کا نام سپرونسکس ہے۔ شہر ایتھنز میں ۴۶۹ ق م قبل مسیح پیدا ہوا۔ بچپن میں باپ سے بت تراشی کا ہنر سیکھا اور ہوش سنبھالنے پر اہل علم کی صحبت چسکا پڑا۔ اس لئے فلسفہ و حکمت کی تحمیل پر سخت کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ذہن کی صفائی اور عقل خدا داد کی رسائی سے ایسی لیاقت ہم پہنچائی کہ یونان میں مشہور ہو گیا۔

پاکبازی - انصاف پسندی - ریاضت - نیکدلی - خدا پرستی - سچائی - دُنیا سے کنارہ کشی - اور حلم و بردباری میں بے مثل تھا۔ علم و حکمت کی خدمت بے منت پرستی سے نفرت - اور دوسروں کو بھی بتوں کی پرستش سے منع کیا کرتا - اسی علت میں اس کی جان گئی - کیونکہ وہ اپنے ہموطنوں سے جو

بت پرستی میں غرق تھے ایک بے مثل اور ان دیکھے
خدا کی عبادت کرنے کی تاکید کیا کرتا تھا۔ بڑے بڑے
معزز یونانی سرداروں اور اُن کے مذہبی پیشواؤں
سے اس بارہ میں مناظرہ اور مباحثہ کرتا۔ اور اپنے
دلائل سے اُن کو لا جواب کر دیتا۔ جب یونان کے
بت پرست کاہن سقراط سے بحث و دلیل میں
ہار جاتے تو وہ کھسیانے ہو کر عام جاہل اور بے
عقل لوگوں کو سقراط کے خلاف جوش دلا کر اُسے
دق کرتے اور اذیت پہنچاتے پ

مقدونیہ کا بادشاہ آرکلاس اسی آرزو میں رہا کہ سقراط
اُس سے کبھی کوئی فرمایش کرے۔ سقراط نے اس کی کچھ
پروا نہیں کی۔ مزاج میں صبر اور استقلال اس درجہ کا
تھا کہ خواہ کیسا ہی حادثہ پیش آئے وہ اُس کا خیال بھی
نہ کرتا تھا۔ ریاضت و نفس کشی کر کے اُس نے اپنی طبیعت
کو ایسا بنا لیا تھا کہ عام جاہلوں کی بد سلوکی سے
آزرہ نہ ہوتا۔ بلکہ جب اس کے شاگردوں نے بہت
زور دیا کہ وہ شادی کر لے تاکہ اس کی نسل باقی
رہے تو بمشکل ان کی بات مانی اور یہ شرط لگائی کہ
جو عورت حد درجہ کی بد صورت و بد مزاج ہو اُس
سے عقد کرونگا۔ تاکہ اس کے ظلم و جبر پر صبر
کرنے سے عام مخلوق کی بد سلوکیاں برداشت کرنے
کی مشق حاصل ہو پ

سقراط کا مقصد اور ولی منشاء یہ تھا کہ کسی طرح

اپنے اہل ملک کے دل پر خوش اخلاقی کا پرتو ڈالے اور ان کو ہم پرستی اور گمراہی کے گڑھے سے باہر نکالے۔ سقراط کے وعظ کی کوئی جگہ مقرر نہیں تھی۔ جہاں دیکھتا کہ بہت سے آدمی جمع ہیں وہیں پسند و نصیحت کا دفتر کھول دیتا اور اُن کو اچھی باتیں رکھنے اور عمدہ کام کرنے کی ہدایت اور بُری باتوں اور خراب کاموں سے دور رہنے کی نصیحت کرتا +

علم حکمت کی عظمت اس درجہ کرتا تھا کہ بعد کے حکما اس کے تتبع سے قاصر رہے۔ کبھی کسی شاگرد کو علمی مسائل لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک مرتبہ کبھی طالب علم نے کہا بھی کہ اگر آپ کی تقریروں اور لکچروں کو قلم بند کر لیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ سقراط نے بگڑ کر اُسے جواب دیا۔ ”علم کو زندہ رہنا میں رکھنا بہتر ہے یا مُردہ جانوروں کی کھالوں میں۔“ مقصد یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنا سینہ علم و حکمت کا خزانہ بنائے نہ یہ کہ کتابوں کو علم کا دفینہ کر دے۔ سقراط کے اس قول سے بھنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں چمڑے کو کاغذ کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طالب علم سے اس نے یہ بھی کہا۔ ”اگر راستہ میں جہاں کتاب وغیرہ پاس نہ ہو کوئی شخص تم سے کسی مسئلہ کو دریافت کر بیٹھے تو کیا تم کو یہ کہنا اچھا معلوم ہوگا کہ گھر چل کر کتاب میں دیکھوں گا۔ اگر یہ بات پسند ہو تو

علمی مسائل کو لکھ لو ورنہ یہ خیال جانے دو“
 یہی وجہ تھی کہ سقراط نے محدودے چند کتابیں
 تصنیف کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شاگردوں
 کو علم کی تدوین کا موقع کم ملا۔ سقراط نے اپنے
 استادوں سے بھی جو کچھ حاصل کیا وہ اسی طرح حاصل
 کیا تھا۔ اور اس کا سینہ جواہراتِ علم کا گنجینہ تھا۔
 علم و حکمت میں جو درجہ سقراط کو نصیب ہوا وہ اس
 سے قبل و بعد کے حکماء نے نہ پایا۔ وہ دنیا کے
 آرائشی سامانوں پر علم کو افضل مانتا۔ چترنگاتِ مکاؤں
 کی رہائش اور حسین و نازنین عورتوں کی صحبت چھوڑ
 کر ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہتا اور ایک سخت بد شکل
 اور زباں دراز عورت کے ساتھ زندگی بسر کرتا۔
 یونان میں دستور تھا کہ جب وہاں کے بادشاہوں
 کو کوئی مہم پیش آتی تو وہ اپنے ملک کے حکیموں
 کو برکت اور کامیابی کے خیال سے ساتھ لے جاتے۔
 سقراط بھی اسی اصول کے مطابق کسی مہم پر اپنے
 فرمانرواے وقت کے ساتھ گیا۔ شاہی کیمپ میں اس
 کے واسطے خیمہ ڈیرہ اور ہر طرح کا سامان موجود تھا۔
 مگر اس نے فوجی پڑاؤ کے قریب ایک کوٹے کے
 کومب میں رہنا اختیار کیا۔ رات کے وقت کوٹے
 میں چلا جاتا اور صبح کو باہر نکل کو دھوپ سینکتا۔
 ایک دن بادشاہ اس کے پاس سے گزرا۔ یہ
 دھوپ سینک رہا تھا۔ بادشاہ نے حکیم کو اس صبح پر

دیکھا تو اس نے سواری روک لی اور پوچھا "مزار کیا ہے؟" سقراط نے کہا "جہاں پناہ کی جان و مال کو دے دیتا ہوں" بادشاہ نے کہا "لشکر میں تمارے لئے ہر طرح کا سامان راحت موجود ہے - پھر تم اس حالت میں کیوں بسر کر رہے ہو - میرے ساتھ چلو" سقراط نے کہا "حضرت عالم! اگر میں سمجھتا کہ آپ کی صحبت سے میرا نفع ہے تو میں آپ سے دور کیوں بھاگتا - ہر وقت خدمت والا میں حاضر رہتا" بادشاہ نے کہا "میں نے سنا ہے کہ تم بتوں کو بُرا کہتے ہو؟" سقراط نے کہا "میں آپ نے سنا ہوگا - مگر میں بتوں کو بُرا بھلا نہیں کہتا - میرا قول تو یہ ہے کہ بادشاہ کو بت پرستی سے دُنیادی فائدہ ہے - اس طرح وہ رعایا پر رعب جھاتا اور انہیں اپنے قابو میں رکھ سکتا ہے - لیکن میرے عقیدہ میں پرستش اُس خدا کی کرنی چاہئے جو تمام عالم کا پیدا کرنے والا اور سب کا روزی رسا ہے - وہ نیکوں کو نیکی کا بدلہ - اور بدوں کو بدی کی سزا دیتا ہے" بادشاہ نے کہا "اچھا اگر تمہاری کوئی حاجت ہو تو بیان کرو - پوری کی جائیگی" سقراط نے سخت بے پروائی سے جواب دیا "آپ نے اور آپ کے ساتھ والوں نے دھوپ روک لی ہے - مجھے سردی لگتی ہے - مہربانی فرما کر دھوپ چھوڑ دیجئے اور

کو بہکاتا اور اُن کی رسیں خراب کرتا ہے۔ اُس کے واسطے موت کا فتوے طلب کیا۔ جس وقت یہ سازش حکیم سقراط کے برخلاف ہوئی۔ اس کے دوست اس کے بچانے کے لئے مستعد ہوئے خاص ایک دوست نے جو اپنے زمانے کا بڑا فصیح تھا۔ اس کے بچاؤ میں بہت کچھ کہا۔ مگر کوئی تدبیر پیش نہ کئی۔ اور آخر کار جواب دہی کے لئے وہ کچھری میں طلب ہوا۔ جس وقت حکیم سقراط حکام عدالت کے روبرو گیا۔ اُس وقت بڑے استقلال اور دلیری اور فصاحت کے ساتھ جواب و سوال کئے۔ اور جو بات سچ تھی۔ اس کی حقیقت سب بے کم و کاست بیان کر دی۔ اس زمانے میں دستور تھا۔ کہ مجرم اپنے اہل و عیال کو ترچم کی اُتید پر منصفوں کے سامنے کچھری میں لاتے تھے۔ مگر اس جوانمرد نے اس سے بھی احتراز کیا۔ جس طرح اس مقدمے میں اس نے عدالت میں گفتگو کی۔ اور حکام کے روبرو اظہار دئیے۔ افلاطون نے انہیں قلمبند کیا ہے۔ اور عذر سقراط اُن کا نام رکھا ہے۔ اس عمدہ تقریر میں سے کچھ ہم بھی نقل کرتے ہیں :-

سقراط کے اظہارِ حکامِ عدالت کے سامنے

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے۔ کہ میں اس شہر کے باشندوں اور جوانوں کے اخلاق بگاڑتا ہوں۔

اور مذہب میں بدعتیں نکالتا ہوں - ایتھنز میں میں نے متعلیٰ کا پیشہ کب اختیار کیا تھا - اور کب کچھ لے کر کم کو پڑھایا تھا ؟ کہ آج اس گناہ میں پکڑا جاتا ہوں - میری مفلسی میری بے گناہی کی گواہ ہے - اور میرا شاہد میرا حال تباہ - جیسا میری رائے میں آیا - ہر ایک امیر و غریب کو سمجھایا - جو چاہے مجھ سے بحث کر لے - اور میری بات کا جواب دے - میری غرض نصیحت سے صرف نیکی کا راستہ بتانا تھا - ہر ایک پیر و جوان کو میری نصیحت یہ تھی - کہ بیحد تن آسانی کو چھوڑو - اور اس دُنیا سے فانی کی بے انداز خوشیوں سے مُنہ موڑو - دُنیا غدار ہے اور دولت ناپائدار + نیکی سے دولت بدل سکتی ہے - نہ کہ دولت سے نیکی - پس اے ایتھنز کے رہنے والو ! اگر یہی میری خطا ہے - تو جو تمہارے جی میں آئے مجھ پر فتوے لگاؤ - میں اپنی طبیعت بدل نہیں سکتا - میں اپنے قول پر قائم ہوں - مجھ کو خدا نے ہدایت کی ہے - کہ میں اپنے ہموطنوں کو راہِ راست بتاؤں - میں ہرگز اس ارادے کو نہ چھوڑونگا اور تحصیلِ علم اور مطالعہ کتب اور تربیتِ عوام سے ہرگز مُنہ نہ موڑونگا - تمہارے محکم کی نسبت خدا کے محکم کا میں زیادہ فرماں بردار ہوں - جب تم میرے سامنے آؤ گے - میں تمہیں یہی نصیحت کرونگا - اور سمجھاؤنگا - کہ اے میرے دوستو ! ایتھنز کے باشندو ! آج عقل

و دانائی میں کسی شہر کے رہنے والے تم سے ہمسری
 نہیں کر سکتے۔ تم کو لازم ہے۔ کہ ناپائدار خوشیوں
 سے کنارہ کرو۔ اور دانائی و راستی کے رستے پر آؤ۔
 میں بہت عاجزی سے التماس کرتا ہوں۔ کہ یہ میرا
 کلام جو بسبب اپنی راستی کے میں بہت صفائی سے
 بیان کر رہا ہوں۔ تم پر گراں نہ گزرے۔ اے
 میرے ہموطنو! ہر چند میں نہایت بیکیسی کی حالت
 میں ہوں۔ لیکن اس پر بھی اُن لوگوں کی پیروی
 نہ کرونگا۔ جو اپنے دوستوں۔ اور رشتہ داروں اور بچوں
 کو رحم دلانے کے لئے منصفوں کے روبرو عدالت میں
 لاتے ہیں۔ اور اُن کے سامنے روئے اور گڑ گڑاتے
 ہیں۔ یہ کچھ شیخی اور غرور کی راہ سے نہیں۔ بلکہ
 میرے ایسا ہونے میں تمہاری اور تمہارے ملک کی
 شان ہے۔ مجھے یہ بات منظور نہیں کہ منصف کی
 منت کر کے گناہ بخشوا لوں۔ کیوں کہ منصف انصاف
 کے لئے اجلاس کرتا ہے۔ نہ انصاف کے توڑنے کے
 لئے۔ منصف اپنے عہدے پر مقرر ہونے کے وقت
 اس بات کی قسم نہیں کھاتے۔ کہ ہم گنہگار کو یا
 جسے ہمارا دل چاہیگا بے سزا چھوڑ دیں گے۔ بلکہ اس
 بات کا صنف اٹھاتے ہیں۔ کہ ہم انصاف کو ہاتھ سے
 نہ دیں گے۔ اب چونکہ تم نے مجھ کو اپنی دانت میں
 گنہگار ثابت کر لیا ہے۔ تم کو اختیار ہے۔ کہ بے
 تامل مجھ کو سزا دو۔ اے حاکمو! مجھ سے اس بات

کی توقع مت رکھنا۔ کہ میں الزام کے خوف سے اس نیک بات کو جسے میں دل سے اچھا جانتا ہوں۔ بُرا کہنے لگوں اور پشیمان ہو کر تم سے رجوع کروں۔ اس وقت تم سے التجا کرنا۔ اور یہ کہنا کہ مجھ سے درگزر کرو۔ گویا تمہاری منصفی کے حلف کو ٹھوڑا نا ہے اور اس کے یہ معنے ہیں۔ کہ میں بے ایمان ہوں۔ اور خدا کا مجھے یقین نہیں۔ مجھے خدا کے ہونے کا یقین ہے۔ اور اُس حاکم حقیقی کے انصاف پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ پس جو سزا تمہارے دل میں آئے میرے واسطے تجویز کرو۔

حکیم سقراط جیسا صاف اور بے گناہ تھا۔ ویسے ہی صفائی کے ساتھ نڈر اور بے دھڑک حکام کے سامنے اس نے گفتگو کی۔ ایسی بے لگاؤ گفتگو سے منصفوں کے دل میں خفگی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اکثر لوگ چاہلوسی اور خوشامد کو پسند کرتے ہیں ع خوش آمد ہر کہ را گفتی خوش آمد

اگر یہ بھی اس کابینہ پن کو اختیار کرتا تو شاید بچ جاتا۔ اس کے اظہار کے وقت پانچ سو منصفوں کا اجلاس تھا۔ اول تو انہوں نے بالاتفاق اس کی قید کا فتوے دیا۔ لیکن سقراط نے اس خیال سے کہ اگر میں قید ہوں گا تو لوگ مجھ کو حقیقت میں مجرم جانینگے۔ اسے قبول نہ کیا۔ اس انکار نے ان کو اور ہر افروختہ کیا۔ اور انہوں نے یہ حکم دیا۔ کہ اس کو زہر سے

ہلاک کیا جائے +

اس پر سقراط نے یہ کہا۔ بہت بہتر ہیں جاتا ہوں۔ اور تمہارے محکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ کیونکہ روزِ ازل سے میرے مُقدّر میں یہی لکھا تھا۔ اسے کون مٹا سکتا ہے؟ مجھ سے یہ اُمید کبھی نہ رکھنا۔ کہ میں تمہاری خوشامد کروں۔ کیونکہ گنہگار کو آزمائش کے وقت اور بہادر کو لڑائی کے وقت کینے جیلوں سے اپنی جان بچانی سزاوار نہیں ہے۔ اس کے ایک شاگرد کو اس امر سے بڑا رنج ہوا۔ اُس وقت سقراط نے اُسے سمجھایا۔ کہ اے عزیز صبر کر میں گنہگار نہیں مرتا۔ جو تو میرے واسطے ماتم کرتا ہے۔ میرے دشمن میرا مال۔ اور میری تندرستی اور زندگی مجھ سے چھین سکتے ہیں۔ لیکن میری نیکی۔ اور بے گناہی اور اُولو العزمی اور دل کی بُزرگیوں کا خزانہ جس کا عوض مجھے میرا پروردگار دیگا۔ کون مجھ سے لے سکتا ہے۔ سقراط ایک مہینے تک اس محکم کے بعد قید رہا۔ مگر اس کے دل پر ذرا طلال اور موت کا کچھ ڈر نہ تھا۔ ان مصیبت کے دنوں میں بھی اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ہمیشہ نصیحتیں کئے گیا۔ اور ستائش ایندوی میں ہر وقت تر زبان رہا +

کریٹو لکھتا ہے۔ کہ جس صبح سقراط کو زہر دیا جائیگا۔ اس کی رات کو وہ اپنی عادت کے موافق بہت

لے یہ شخص سقراط کا شاگرد اور اس کا بڑا رفیق تھا +

و بھمی اور اطمینانِ خاطر کے ساتھ سویا۔ اور اُس کے
 پھرے سے کوئی علامت رنج کی ظاہر نہ ہوئی۔ یہاں
 تک کہ جب صبح کو قید خانہ کے داروغہ اور کمرہ ٹو
 نے اُسے فمائش کی۔ کہ آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔
 اُس وقت یہ ہنسا۔ اور بولا۔ ”اے احمقو! کوئی ایسی
 جگہ ہے جہاں موت سے میں بالکل بچا رہوں؟ اگر
 کوئی ایسی جگہ تمہاری نظر میں ہو۔ تو چھپا کر مجھے
 لے چلو“ ہر چند اُس کے شفیعوں نے اُسے سمجھایا۔
 کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ لیکن اُس نے ہرگز نہ مانا۔
 اور یہ کلمات کہے۔ ”اے میرے نہایت پیارے کریٹو!
 بتو جانتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اور انسان
 کا کوئی فعل اُس سے پوشیدہ نہیں۔ پھر مجھ سے
 کیوں کہتا ہے۔ کہ یہاں سے بھاگ جاؤ؟ میری تقدیر
 میں خدا نے یہی موت لکھی ہے۔ پھر میں کیونکر
 اس سے بھاگ سکتا ہوں۔ انسان کو ایسی بات
 کا دل میں خیال بھی نہ لانا چاہیے۔ جو خدا کی
 مرضی کے برخلاف ہو۔ تو خوب جانتا ہے۔ کہ
 انسان کے قہر سے ہر کوئی بھاگ سکتا ہے۔ لیکن
 جس بے نصیب پر خدا کی نظر قہر ہو۔ وہ بھاگ
 کر کہاں جائے؟ اب ایسا گوشہ کوئی مجھے بتا
 جہاں اُس سے چھپ کر میں جاؤں؟“
 یہ سن کر کریٹو چپ ہو گیا۔ اور وہاں سے
 چلا آیا۔ جب صبح کو اُس کے تمام دوست اور شاگرد

حکیم افلاطون کے سوا جو بہت بیمار تھا۔ اُس نے
 ملنے کے لئے قید خانے میں آئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔
 کہ بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور سقراط کے پاس اُس کی
 بیوی اپنے بچوں کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ بے
 اختیار اُن کا دل بھر آیا۔ اور اس کی بی بی چلائی اور
 رو کر اپنے خاوند سے کہنے لگی۔ "اے میرے پیارے
 اے میری جان سقراط! تیرے دوست اس آخری
 وقت میں تجھے دیکھنے اور تیری قدیموی حاصل کرنے
 آئے ہیں" سقراط کے حال میں اس وقت بھی کچھ
 تغیر نہ تھا۔ نہایت استقلال اور اطمینان کے ساتھ
 اپنے دوستوں سے ہمکلام ہوا۔ اور ان کو نصیحتیں
 کہیں۔ اور رُوح کے غیر فانی ہونے کے باب میں
 ایسی معقول دلیلیں پیش کیں۔ کہ زمانہ حال اور
 سلف کے بڑے بڑے فاضل بھی ان کی تعریف کرتے
 ہیں۔ اس نے اُنہیں سمجھایا۔ کہ انسان کی روح مرنے
 کے بعد فنا نہ ہوگی۔ اور احکم الحاکمین بدوں کو سزا
 اور نیکوں کو جزا دیگا۔ اگر انسان کی روح کو فنا ہو۔
 تو گنہگاروں کو جنہوں نے ہر طرح کی بدی کی ہے۔
 اور خدا کے حکموں کو توڑا ہے۔ کیونکر سزا ملیگی۔ اور
 اُن لوگوں کو جنہوں نے زندگی بھر نفس مارا۔ اور
 لذتوں کو چھوڑا۔ اور خدا کی بندگی کرتے رہے۔ اُن
 کی محنتوں کا اجر کس طرح ملیگا؟ اگر انسان کی روح
 کو فنا ہو تو پھر نیکی سے کیا فائدہ؟ "نم قطعاً یقین"

کرو ! کہ انسان کی روح کو فنا نہیں ۔ بد آدمی اپنی
 بدی کی سزا پائینگے ۔ اور جو گنہگار قابل بخشے کے
 ہیں ۔ بخشے جائینگے ۔ اور جو نیک اور خدا پرست
 ہیں ۔ اُن کو اُن کی محنتوں کا اجر ملیگا ۔ تم کو
 لازم ہے کہ نیکی کرو ۔ اور انعام کے اُمیدوار رہو ۔
 دیکھو نیکوں کو کیسی خوشی ۔ اور اُن کو کیا کیا امیدیں
 ہیں ۔ ہر وقت اُن کا دل مطمئن رہتا ہے ۔ اور
 دُنیا کی تکلیفیں اور زمانے کے حادثے اُن کے عزم
 اور استقلال میں خلل انداز نہیں ہوتے ۔
 اس کے بعد کریٹو نے پوچھا ۔ کہ آپ کے بال بچوں
 کی ہم کس طرح پرورش کریں ؟ اُس نے کہا خدا
 ان کا نگہبان ہے ۔ جس طرح وہ چاہیگا انہیں پالےگا
 پھر کریٹو نے پوچھا ۔ کہ ہم لوگ آپ کو دفن کس طور
 سے کریں ؟ کہا کہ ” میری روح خدا کی بارگاہ میں
 تقرب کا درجہ پائیگی ۔ یہ جسم جس کی اصل خاک
 ہے ۔ جس طرح چاہو ۔ خاک میں ملا دینا اُس کے
 تینوں لڑکوں کو جن میں سے دو بہت چھوٹے تھے
 بگ اس کے سامنے لائے دو چار باتیں کر کے اُس
 نے انہیں رخصت کر دیا ۔ تھوڑی دیر بعد خدنگاروں
 نے آکر خبر دی ۔ کہ زہر پینے کا وقت آ پہنچا
 ہے ۔ فرمایا کہ زہر کا پیالہ لے آؤ اور خوشی
 خوشی سب پی لیا ۔ یہ حال دیکھ کر داروغہ محبس
 کے آنسو بہل پڑے اور جب وہ سب پی چکا ۔

تو اُس کے تمام دوست اور رشتہ دار جو دیر سے اپنے رنج کو ضبط کئے بیٹھے تھے۔ دل پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور بے اختیار نالہ و فریاد کرنے لگے۔ اور کریٹو نے اتنا غل مچایا۔ کہ تمام حاضرین بے تاب ہو گئے۔ اب تو دل کھول کے روتے ہیں کہ آئی سر پر وہ مصیبت کہ بہت تھا ہمیں رنجس کا دھڑکا تب سقراط نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ ”اے عزیزو! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ اور تمہاری ثابت قدمی کہاں گئی؟ میں نے عورتوں کو اسی واسطے یہاں سے رخصت کیا ہے۔ کہ وہ ایسے وقت میں صبر نہیں کر سکتیں۔ خدا کے لئے تم۔ ذرا صبر کرو۔ اور اپنے دل میں ضبط کو جگہ دو۔“ اس کہنے سے وہ چُپ ہوئے۔ اور سقراط ادھر ادھر ٹھلا کیا۔ آخر کو جب زہر کا اثر بڑھا۔ اور اس کی ٹانگیں چلنے سے رہ گئیں۔ تو وہ ہچکھونے پر لیٹ گیا۔ پھر زہر کا اثر لحظہ بلحظہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ اور اس کے طائرِ روح نے تنفسِ عنصری سے پرواز کی۔ جب دم نکل چکا۔ کریٹو نے اس کا مُنہ اور آنکھیں جو کھلی رہ گئی تھیں بند کر دیں۔

افلاطون نے جو اس کی وفات کا حال لکھا ہے۔ ایسا پُر تاثیر ہے کہ جو اسے پڑھتا ہے بے روئے اُس سے رہا نہیں جاتا۔ اس واقعہ کے

بعد افلاطون اور سقراط کے دوسرے شاگرد اپنی جان کے خوف سے ایٹھنز کو چھوڑ کر اقلیدس کے ہاں چلے گئے۔ - یودی پذیر نے اس کے مرنے کے بعد ماتم کیا۔ اور ایٹھنز کے باشندوں کو ایسے بے نظیر شخص کے مار ڈالنے پر نہایت لعنت ملامت کی +
تھوڑے دنوں کے بعد جب ایٹھنز والوں کے دلوں سے توہمات باطل دور ہوئے۔ تو انہوں نے سقراط کی موت کا بڑا رنج کیا۔ اور چند روز تک تمام مدرسوں اور بازاروں اور کوچوں میں یہی چرچا رہا۔ آخر لوگ قائل ہوئے۔ کہ سقراط نے ہمارے بچوں کو خوب تربیت کی۔ اور حب الوطنی اور نیکی انہیں سکھائی۔ مگر افسوس! ہم نے اُن نیک خدوتوں کا کیا بُرا عوض دیا۔ اب اہل ایٹھنز نے اس کے خون کا بدلہ لینے پر کمر باندھی۔ اور سقراط کے مدعی اس بے گناہ کے خون کی جواب دہی کے لئے طلب ہوئے۔ مدرسے بند ہو گئے۔ اور چند روز تک تمام دنیوی کار و بار معطل رہے۔ آخر کو ملتس جن نے سقراط کو ملزم ٹھیرایا تھا۔ قتل ہوا۔ اور

۱۵ یہ اقلیدس سقراط کا ایک شاگرد تھا۔ اور وہ اقلیدس جس کی کتاب تحریر اقلیدس مشہور ہے۔ سقراط کی وفات کے ۵ برس بعد پیدا ہوا تھا +

۱۶ یہ سقراط کا ایک دوست اور یونان کا بڑا نامی گرامی شاعر گزرا ہے +

تمام منصفان عدالت جنہوں نے اس کے قتل کا فتوے دیا تھا۔ جلا وطن کئے گئے۔ مؤرخ پلوٹارک کہتا ہے۔ کہ جو لوگ ان میں سے بچ کر رہ بھی گئے۔ اُن کا یہ حال ہوا۔ کہ لوگوں نے ان سے بولنا چھوڑ دیا۔ اور انہیں ناپاک شمار کرنے لگے۔ جس حمام میں وہ نہاتے جب تک وہ صاف نہ ہو لیتا۔ کوئی اُس میں نہ نہاتا۔ اسی طرح یہ لوگ زندگی سے ایسے تنگ ہوئے۔ کہ اُنہوں نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا۔ اہل ایٹھنز نے صرف عوض لینے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ایک مکان تعمیر کیا۔ اور اس میں سقراط کی شکل کا ایک بت بنا کر رکھا۔ کہ یادگار رہے ۛ

سقراط کی عمر کے بارے میں کئی قول ہیں۔ کوئی ایک سو سال سے زائد بتاتا ہے۔ اور کسی نے کم کہا ہے۔ افلاطون نے اپنی ایک کتاب میں سقراط کی وہ آخری تقریر درج کی ہے جو اس نے قطع حجت کے طور پر اہل ایٹھنز کو مخاطب بنا کر کی تھی۔ اس تقریر میں خود سقراط نے کہا تھا۔ کہ ”میری عمر ستر سال کی ہو گئی ہے“ چونکہ یہ تقریر اس کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے کی ہے۔ لہذا قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور ”حنین بن اسحق“ کہتا ہے کہ سقراط اور افلاطون دونوں کی عمر

تقریباً برابر ہوئی اور افلاطون اسی سال زندہ رہا تھا۔
سقراط کی انگوٹھی پر کندہ تھا۔ ”جس کی نفسانی
خواہش اس کی عقل کو مغلوب بنا لیگی وہ رسوا
ہوگا۔“ سقراط کی حکمت آئینہ باتیں بے شمار ہیں
کہتا ہے :-

”جس کو یہ معلوم ہو جائے کہ دُنیا فانی ہے۔
اگر اس پر بھی وہ دُنیا میں پھنس کر غیر فانی عالم
(یعنی آخرت) کو بھول جائے۔ تو سخت حیرت کی
جگہ ہے۔“

”چھ آدمی ہمیشہ مغموم اور مترّد رہتے ہیں۔
کینہہ ور۔ حاسد۔ نیا دولتمند۔ فقر و محتاجی سے ڈرنے
والا مالدار۔ طالبِ رُتبہ جو اپنی آرزو میں ناکام
رہے اور ادب والوں کا بے ادب ہمنشین۔“
”عقل خدا کی دین سے اور علم و ہنر اپنی
محنت سے حاصل ہوتا ہے۔“
”عقلندہ کو لازم ہے کہ جاہل سے یوں کلام
کرے جیسے کہ طبیب مریضوں سے باتیں کرتا
ہے۔“

”آدمی کا کہاں یہ ہے کہ دشمن تک اس پر
بھروسہ کرے۔ لیکن جبکہ دوست کو بھی اس پر
اعتماد نہ ہو تو کمال کہاں۔“
”خوش اخلاق ہمیشہ خوش و خیم اور قیدِ مصیبت
سے آزاد رہتا ہے۔“

عورتوں کے بارے میں سقراط کی رائے دریافت کی گئی تو کہا۔ اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کنبہ کا درخت۔ دیکھنے میں خوشنما اور دلفریب۔ مگر کھاؤ تو زہر قاتل ہے۔

سقراط نے محض گنتی کی چند کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ایک رسالہ فلسفہ اور قانون قدرت کی تطبیق میں۔ یہ اپنے بھائیوں کے لئے لکھا تھا۔ کتاب معاقبتہ النفس اور مقالہ دربارہ سیاست۔ اور اخلاق و تہذیب نفس کے متعلق بھی اس نے ایک رسالہ لکھا تھا۔



افلاطون

فلاطون اور فلاطُن بھی اس کے نام ہیں۔ رومانی قوم کا فرد۔ اور شہر ایتھنز (یونان) کا رہنے والا تھا۔ یہ طبِ یونانی کا موجد مانا جاتا ہے۔ علم ہندسہ کا بھی بڑا ماہر تھا۔ فن طب میں اس کی صرف ایک کتاب بِلقی ہے جو اس نے اپنے شاگرد ”پلامادس“ کے لئے تحریر کی تھی۔ فلسفہ و حکمت کی کثیر تصانیف اس کی یادگار ہیں۔

باپ کا نام ارستون تھا۔ جو یونان کے مشہور شریف خاندان اولادِ اسقلیبیوس سے تھا۔ افلاطون

کی بلن یونان کے نامور قانون ساز سولن کے خاندان کی لڑکی تھی *

افلاطون نے بچپن سے ابتداءے جوانی تک زبانہدانی اور شاعری کی تحصیل و تکمیل کی۔ اور ان علوم میں کمال اور شہرت حاصل کی۔ جوانی کے زمانہ میں دلپذیر نظم کہا کرتا اور اہل فن سے داد سخن لیتا رہتا۔ علم و کمال کا مذاق اس کو حکما اور علماء کی صحبت میں بھی لے جاتا تھا۔ حکیم سقراط کی مجلس میں اکثر حاضر ہوتا۔ ایک دن سقراط سے شعر و شاعری کی مذمت سنی۔ سقراط نے بیان کیا کہ شاعر فضول و مانع سوزی اور وقت ضایع کر کے نفسانی کمال نہیں حاصل کرتے اور اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حکیم کی بات افلاطون کے دل میں جم گئی۔ اسی وقت سے شعر و سخن کے مشغلہ کو ترک کیا اور سقراط کی خدمت میں علوم حکمت کا درس لینے لگا *

افلاطون نے برابر پانچ سال سقراط کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ اور جب سقراط فوت ہو گیا تو اس نے ملک مصر کا سفر کر کے وہاں فیثاغورث کے شاگردوں سے درس لیا۔ اس طرح علوم حکمت و ہندسہ اور ریاضی وغیرہ میں کامل ہو کر اپنے اصلی وطن شہر ایتھنز میں آیا جس کو عرب مؤرخین مدینۃ الحکماء کہتے ہیں۔ افلاطون نے ایتھنز میں

ایک مدرسے کی بنا ڈالی اور علم و ہنر کے شائقین کو فیض پہنچانے میں مصروف ہوا ۔
 ایٹھنز میں سچے دن مقیم رہ کر افلاطون نے
 جزیرہ سیسلی کا سفر کیا۔ مگر سیسلی کا حاکم
 ”دیونیوسیوس“ کسی وجہ سے افلاطون کے خلاف
 ہو گیا۔ اُس نے اس خدا پرست حکیم کو بہت
 اذیت پہنچائی۔ حکیم افلاطون بڑی مشکلوں سے
 ظالم دیونیوسیوس کے پنجہ سے رہائی پا کر اپنے
 وطن شہر ایٹھنز میں واپس آیا۔ اس مرتبہ افلاطون
 کی طبیعت کا رنگ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ خوش
 خلق، ہمدرد، خلّاق، مخیر اور رقیق القلب ہو گیا تھا۔
 ہر وقت اہل حاجت اس کو گھیرے رہتے۔ غربا اور
 مساکین کی مدد کرنا اس کا سب سے محبوب کام
 تھا۔ دوستوں سے اچھا سلوک کیا کرتا۔ اور امیر و
 غریب سب سے باخلاق و تواضع ملتا ۔
 ایٹھنز والوں نے ارادہ کیا کہ افلاطون کو اپنا
 دارالمہام سلطنت مقرر کریں۔ وہ اس کے پیچھے
 پڑے کہ عمدہ امارت قبول کرے۔ لیکن افلاطون
 نے انکار کیا اور معافی چاہی۔ سبب یہ تھا کہ افلاطون
 کی رائے میں ایٹھنز والے ناقابل اصلاح تھے۔ ان
 کی عادتیں مدت کی بگڑی ہونے کے باعث بہتہ
 ہو گئی تھیں۔ اور افلاطون اُن فضول رسوم کا
 مخالف تھا جو اُس کے ہموطنوں کے نزدیک ضروری

اور رکن مذہب بن گئی تھیں۔ لہذا یقینی تھا کہ افلاطون انتظام ملک کی باگ ہاتھ میں لے کر اُن کے عادات و خصائل کی اصلاح کرنا چاہتا۔ اور سب اہل وطن اس کے دشمن ہو جاتے اور جیسے اُس کے اُستاد سکراط کو قتل کیا تھا ویسے ہی افلاطون کی جان کے بھی گاہک بنتے *۔

افلاطون نے اگلی اسی برس کی عمر پائی۔ وہ خوش خلق۔ نیک چلن۔ رقیق القلب۔ متحمل مزاج۔ اور سہولیت پسند تھا۔ اس کی نصیحتیں۔ اور حکمت آمیز مقولے نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ وہ خلوت پسند تھا۔ اکثر جنگل اور میدان میں زکل جاتا۔ اکیلا بیٹھ کر مناجات پڑھا کرتا۔ کبھی خون خدا اور یاد اعمال سے دھاڑ مار کر روتا اور گاہے چپکے چپکے آنسو بہا کر گریبان و دامن بھگوتا۔ جب چلا کر گریہ و زاری کرتا تو دو میل تک آواز جاتی۔ اور لوگ اسی کو سن کر معلوم کر لیتے کہ افلاطون فلاں مقام پر ہے۔ اُس کی انگشتی کے نگین پر کندہ تھا۔ متحرک کو ساکن بنانے کی نسبت ساکن کا متحرک کر دینا بہت سہل ہے *۔

اس کا حلیہ یہ تھا۔ گندم رنگ میانہ اندام خوبصورت۔ خط بھرا ہوا۔ ڈاڑھی خوشنا۔ سگالوں پر ہفت کم بال تھے۔ مزاج ٹھیرا ہوا تھا۔ باتیں بہت آہستہ اور سنبھل سنبھل کر کیا کرتا۔ آنکھیں چمکدار سفید تھیں جن پر سرخ ڈوموں کی پھین بھلی معلوم دیتی۔ ٹھوڑی

پر ایک کالا رتل تھا۔ اور سینہ کشادہ تھا۔ افلاطون کی گفتگو کمال دلچسپ ہوتی۔ اس کی تقریر سن کر لوگ محو ہو جایا کرتے۔ اکثر نصیحت و ہدایت اس طریقہ سے کیا کرتا کہ بات ڈھال کر کہتا۔ مثلاً اگر زید کو نصیحت کرنا منظور ہے تو عمر۔ بکر۔ خالد میں سے کسی کو مخاطب بنا کر ایسی باتیں کرتا جن سے زید کی سمجھ میں آ جاتا کہ در پردہ اُسے فہمائش کی جاتی ہے +

افلاطون کے شاگرد کثیر تھے۔ مگر اُن میں سے دو آدمی اس کے جانشین ہوئے۔ ایک ”کسانوقراطیس“ اور یہ ایٹھنز کی اتھامیڈا (اکیڈمی) میں درس دیا کرتا۔ اور دوسرا ”ارسطو“ طالبس تھا جو کہ شہر ایٹھنز کے مضافات میں ایک گاؤں ”ٹوقین“ کے اندر ایک مدرسہ میں بیٹھ کر شائقین علم و حکمت کو مستفید کیا کرتا تھا۔ خود افلاطون نے سقراط اور پلماوس سے علم حکمت و فلسفہ حاصل کیا تھا اور اس کے خیالات اور رائیں انہی دونوں حکیموں کی راہوں سے ماخوذ تھیں +

افلاطون نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی تصانیف میں خاص بات یہ پائی جاتی ہے کہ چار چار کتابیں ایک ہی علم کے سلسلہ میں لکھی گئی۔ اور اسی واسطے ہر چار کتابوں کا نام ”رابوع“ ہے۔ اور ان میں سے ہر اک رابوع کا سلسلہ دوسرے رابوع کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کتاب میں ایک

خاص موضوع بیان کیا گیا ہے لیکن وہ خاص موضوع
 بھی کسی عام موضوع کے نیچے داخل ہے۔
 اس کی حکمتیں اور نصیحتیں بہت سی ہیں۔ ان میں
 سے دو چار منقولے بطور نمونہ ذیل میں درج کئے
 جاتے ہیں۔ کہتا ہے :-

”اگر حکیم آدمیوں سے دُور بھاگتا ہے تو اس کا
 طلب کرنا ضروری سمجھو۔ لیکن جبکہ وہ اور لوگوں کی
 تلاش میں پایا جائے تو خود اس سے دُور بھاگو۔“
 ”جو شخص عزت و دولت رکھنے کی حالت میں اپنے
 عزیزوں اور دوستوں کی مدد اور اُن کی حاجت روائی
 نہیں کیا کرتا۔ تنگی اور مفلسی کے وقت میں دوست اور
 رشتہ دار بھی اُس کے کام نہیں آتے۔“
 جن کی طبیعتیں بد ہیں وہ لوگوں کی بُرائیاں ہی
 اختیار کرتے ہیں اور ان کی غریبوں کی پابندی سے
 دُور بھاگتے ہیں۔“



اَرِسْطُو

نام و نسب :- ارسطاطالیس نام - نقوماخس - یا -
 نیکوماخس کا فرزند تھا - ارسطو اس کا معروف نام
 ہے - اس کا باپ شاہ ”امنطس“ کا طبیب تھا - اور
 امنطس اسکندر اعظم کا دادا ہے - نیکوماخس کا سلسلہ

نسب حکیم ارسطیوس سے ملتا تھا اور اس کی بی بی یعنی ارسطو کی والدہ افسطیا بھی اسی خاندان کی لڑکی تھی۔ اس طرح حکیم ارسطو نہایت نجیب الطرفین ہے * ولادت و تربیت :- ملک یونان کے علاقہ تھیرس میں ایک بستی "اسطاغیرا" ہے۔ وہیں مسیح قبل مسیح ارسطو کی ولادت ہوئی۔ اور سات سال کی عمر تک ماں باپ کے آغوشِ محبت میں پلتا رہا *

ابتدائی تعلیم :- آٹھویں سال میں قدم رکھتے ہی نیکوماخس کو ہونہار بیٹے کی تعلیم کا خیال ہوا۔ اس وقت ملک یونان میں مدینۃ الحکماء ایتھنز ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں صاحب کمال عالموں اور حکیموں کا جگھٹ رہا کرتا تھا۔ نیکوماخس وہاں آ رہا اور ارسطو کو زبانِ دانی۔ فصاحت و بلاغت اور نظم و نشرِ ادب کی تعلیم مختلف نامور استادوں سے دلوائی۔ نو سال کے قلیل عرصہ میں ارسطو نے ان فنوں میں پوری مہارت بہم پہنچالی۔ اور اب فلسفہ و حکمت کا قدرتی شوق اسے حکیم افلاطون الہی کی خدمت میں لے گیا۔ جس وقت وہ افلاطون کے حلقہٴ درس میں شامل ہوا ہے اُس وقت اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اور بیس سال کامل اس نے افلاطون کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ خدا داد طبیعت اور ذہنِ رسا نے استاد کی نظرِ عنایت اس کے حال پر مبذول کر دی۔ حکیم افلاطون بڑی توجہ سے ارسطو کو حکمت کے مسائل اور اسرارِ طبیعیات

بتایا کرتا تھا۔ اس مدت میں ارسطو نے علوم اخلاق -
 تہذیب نفس - سیاست مدن - طبیعیات - الہیات - اور
 ریاضیات کی تحصیل پوری کر لی - حکیم افلاطون کا معمول
 تھا کہ وہ بغیر ارسطو کی موجودگی کے کبھی باریک علمی
 مسائل پر تقریر نہ کیا کرتا - وہ حاضر نہ ہوتا تو بلوا
 بھیجتا - افلاطون دوسری مرتبہ جزیرہ سسلی کو گیا تو
 اس کی جگہ اکاڈمی میں ارسطو ہی درس دیا کرتا تھا +
 افلاطون کی سسلی سے واپسی پر ارسطو نے اپنا
 دوسرا مدرسہ مقام لوقیون میں قائم کیا - اور یہ مدرسہ
 مشائی حکماء کا مرکز بنا - افلاطون کی زندگی تک ارسطو
 نے اس کی صحبت نہیں چھوڑی - مگر جس وقت افلاطون
 کا انتقال ہو گیا - اس وقت ارسطو نے امیر ارمیاس
 کی ملازمت کر لی - یہ امیر مقام اترنوس کا فرمانروا
 اور پہلے ایک معمولی غلام تھا - ذاتی جوہر اور لیاقت کے
 ذریعہ سے مرتبہ حکومت پر پہنچ گیا - اس نے اپنی
 زندگی تک حکیم ارسطو کو نہیں چھوڑا اور اس کی ہر
 طرح خاطر و مدارات کی - لیکن جب ارمیاس فوت ہو
 گیا تو ارسطو ایتھنز میں واپس چلا آیا +
 چونکہ ارسطو کی دانائی اور حکمت کا شہرہ یونان
 کے ہر گوشہ میں پھیل گیا تھا - اس لئے مقدونیہ
 کے فرماں روا شاہ فلپس نے اس کو بڑے اکرام
 سے طلب فرما کر اپنے ہونہار فرزند اسکندر اعظم
 کا استاد و اتالیق مقرر کیا - ارسطو نے شاگرد کو

ذہین اور طباع پایا۔ اس لئے بڑی محنت سے اسے علوم فلسفہ و طبیعیات و ریاضیات میں ماہر بنایا۔ سیاست مدن کی عمدہ تعلیم دی۔ تہذیب و اخلاق کا درس دیا۔ اور اس کو ایسا ذی لیاقت بنا دیا۔ کہ شاہ فلپس نے فرزند کی دانائی اور علمی استعداد کا تکملہ ہونے پر حکیم ارسطو کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ خود سکندر اعظم اپنے بزرگ استاد کی بہت کچھ خاطر داری کیا کرتا تھا۔ وہ اس کو اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیتا۔ تمام سلطنت و حکومت کے اہم معاملات میں اسی کے مشورہ پر چلتا اور اسی وجہ سے اس نے اپنی مختصر سلطنت کو بہت جلد ایک زبردست طاقت بنا لیا۔ مالی و منکلی انتظامات درست کئے۔ فوجی قوت بڑھائی۔ اور جب باپ کے بعد اسکندر نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو فتح و تسخیر عالم ترنگ اسے مشرقی ملکوں پر حملہ آور ہونے کی محرک ہوئی +

ارسطو اسکندر کے مصر و شام کی طرف جانے پر اپنے وطن چلا آیا۔ مقدونیا میں اس نے جو درس گاہ قائم کر رکھی تھی وہاں اپنے ایک لائق شاگرد فلستانس کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ ایتھنز واپس آ کر ارسطو دس سال توفیوں میں مقیم رہا۔ لیکن وہ بتوں کی تعظیم اور پوجا نہیں کرتا تھا۔ ایک یونانی کاہن ”اوروماؤن“ نامی ارسطو کا دشمن تھا۔ اس نے ایتھنز کے بست پرستوں کو ارسطو کے خلاف بھڑکایا۔ ان سے

کہا کہ یہ حکیم کافر و ملحد ہے۔ دیوتاؤں کی عزت اور پرستش نہیں کرتا۔ بلکہ اسے بُرا بتاتا ہے۔ یہ بات ارسطو کو بھی معلوم ہو گئی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اسی الزام میں ایٹھنز کے ظالم کفار اور مشرک سقراط جیسے نامور حکیم کی جان لے چکے ہیں اس لئے وہ اپنے انجام سے ڈرا اور ایٹھنز کا قیام ترک کر کے اپنے اصلی وطن استاگیرا میں چلا گیا۔ اہل ایٹھنز میں سے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اسے روکتے یا اس سے بدسلوکی کرتے +

علمی کارنامے :- ارسطو کے علمی کارنامے بہت ہیں۔ وہ فن منطق کا بانی اور موجد ہے۔ معلمِ اوّل کا ممتاز لقب اسی اعتبار سے اس کو ملا تھا۔ اسکندر اعظم سے اس نے یہ تحریک کی کہ یورپ اور ایشیا کے ہر اعظموں سے مختلف اقسام حیوانات کے نمونے جمع کرائے۔ اس حکم کی تعمیل ہو چکی تو ارسطو نے وہ سب جانور ایٹھنز میں منگوا لئے اور ان کو اچھی طرح جانچا۔ ان کے جسمانی اعضاء کی بناوٹ۔ اور افعال کی تحقیق کر کے ان کی قسمیں اور درجے قرار دئے۔ اس کو علم حیوانات کا موجد کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ یورپ میں آج تک اس کی تحقیقات کے اکثر مسائل بدستور رائج ہیں۔ ارسطو نے یہ بات بھی دریافت کی کہ اونٹے درجہ کے نباتات سے اعلیٰ درجہ کے حیوانات تک سب میں

ایک طرح کا تعلق اور سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اور ان کی انواع میں ایک دوسرے کی نسبت جو اختلاف ہے وہ بہت خفیف ہے +

نباتات - اور حیوانات کی ابتداء اور انتہا معلوم کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ بعض نباتات ایسی پائی جاتی ہیں۔ جو حیوانات کی ہم شکل اور ان سے ملتی جلتی ہیں۔ اور ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان کو نباتات کی حد میں رکھیں یا حیوانات کے طبقہ میں داخل کر دیں۔ اس لئے دونو انواع کے مابین ایک برزخ ماننا پڑتا ہے۔ یعنی کچھ چیزوں کا ایک الگ طبقہ بنایا جاتا ہے جو حیوانات اور نباتات دونو طبقوں کی بعض بعض حالتیں رکھتی ہیں +

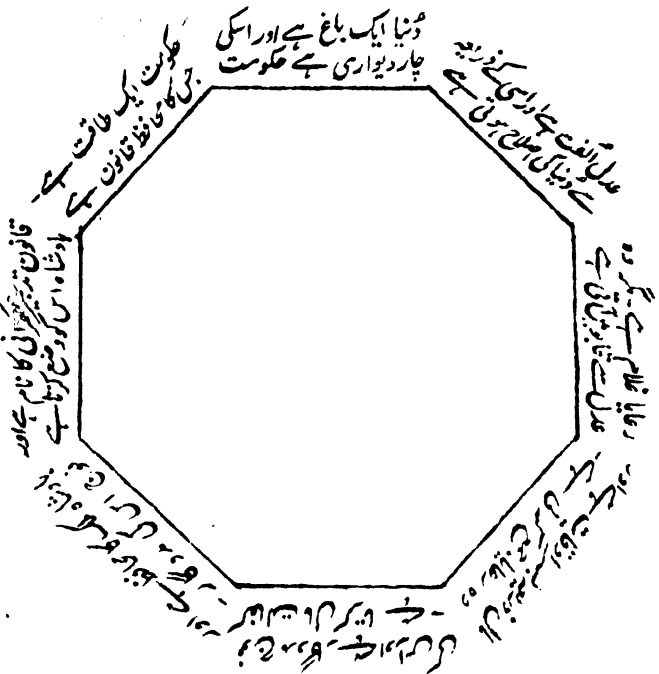
آرسطو نے یہ بھی دریافت کیا کہ نباتات کی زندگی حیوانات کی زندگی سے نسبتاً اونے درجہ کی کمزور اور سادہ ہے۔ اگر ایک پودے کو کاٹ کر اسے پیچ سے دو ٹکڑے کر دیا جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ اس کے متفرق ٹکڑے پھر بڑھنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات صاف طور پر بتاتی ہے کہ پودے کے اجزاء اور اعضاء بہت سادہ ہیں اور وہ ایک دوسرے کی اعانت کے زیادہ محتاج نہیں۔ لیکن حیوانات کی حالت اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ کسی جانور کو لیکر اس کے پیچ سے دو ٹکڑے کر دو۔ یا کٹی مٹے کر ڈالو تو اس کا تمام جسم بیجان اور فنا ہو جاتا ہے۔

اور اُس کے جسم کا کوئی کٹا ہوا عضو بدن سے علیحدگی کچھ بعد ہی مُردار و بیجان ہو کر خراب ہو جاتا ہے ۔

• ارسطو نے اپنے پیشرو ہیئت دانوں کے اقوال کا باہم موازنہ اور مقابلہ کیا ۔ اور ان کی تحقیقات جانچ کر سب سے پہلے زمین کا گول ہونا دریافت کر لیا ۔ اس نے ستارہ مرتخ کا ایک گڑھن بھی دیکھا جو چاند کے ذریعے سے لگا تھا ۔ وہ علم سیاست من میں بڑا ماہر تھا ۔ اس کی کتاب ”السیاست“ بڑی اعلیٰ پایہ کی کتاب ہے ۔ یہ کتاب اس نے اپنے لائق شاگرد اسکندر اعظم کے لئے تحریر کی تھی ۔ اسکندر کو مشرقی ممالک فتح کرنے کے دوران میں بعض پولیٹکل پیچیدگیوں کا سامنا ہوا ۔ اس نے ایسے موقع پر ارسطو کے مشورہ کی ضرورت محسوس کی اور اسے ایک خط لکھا کہ وہ اس کے پاس چلا آئے ۔ ارسطو نے جواب میں بڑھاپے کی کمزوری کے باعث سفر کی تکلیف نہ اٹھا سکنے کا عذر لکھا ۔ اور یہ کتاب بھیج دی ۔ مطلب یہ تھا کہ جہاں میرے مشورہ کی ضرورت پڑے وہاں اس کتاب سے مدد لینا ۔ مشکل آسان ہو جائیگی ۔

اس کتاب میں عدل و انصاف اور رعایا پر مہربانی کی بحد تاکید کی گئی ہے ۔ عہد شکنی سے منع کیا ہے ۔ رعایا کی تعلیم میں سعی کرنے پر آمادہ

بنایا ہے۔ علماء کی قدر و منزلت کو باعث فردغ حکومت قرار دیا ہے۔ غیر معتبر آدمی کے ہاتھ کی کوئی چیز کھانے کی ممانعت ہے۔ اور تمام باتوں کا بخوڑ اس دشمن دائرہ میں جمع کیا ہے :-



ارسطو کے حکمت آمیز اقوال بے شمار ہیں۔ ان میں سے دو ایک نمونہ کے طور پر اس مختصر میں درج کئے جاتے ہیں۔ کتنا ہے :-
 ” ہر شخص میں کچھ نہ کچھ بُرائیاں اور خوبیاں

ضرور ہوتی ہیں۔ کسی شخص کی بُرائی تم کو اُس کی خوبیوں سے فائدہ حاصل کرنے میں مانع نہ ہوتی چاہئے۔ اور کسی شخص کی خوبیاں تم کو اس سے اس طرح کی باتوں میں مدد لینے کی رغبت نہ دلائیں جن میں وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا۔
 ”اپنے نفس کی خود اصلاح کرو۔ لوگ تمہاری آپ ہی پیروی کریں گے۔“

”حق کے پیرو کو صدر اور دین کے پابند کو ضرر نہیں پہنچتا۔“

”قانون کی پابندی اعلیٰ درجہ کی راستبازی ہے۔“

”غفلت کا نتیجہ ندامت ہے۔“

”اپنے ساتھیوں پر جبر کرنا موجب ذلت ہے۔“

”جو دنیا کی محبت میں حد سے بڑھا وہ فقیر مرگیا۔“

اور قانع آدمی غنی ہو کر مرگیا۔“

”جاہل خود اپنا دشمن ہوتا ہے۔ وہ دوسرے

کا دوست کیونکر بن سکیگا۔“

اخلاق و عادات :- ارسطو نہایت خوش خلق -

ہنس مکھ - متواضع - اور نیک دل تھا۔ بڑوں کا ادب

کرتا۔ چھوٹوں سے بر محبت پیش آتا۔ دوستوں سے

اچھا سلوک کیا کرتا۔ مصیبت کے وقت ان کی مخلصانہ

مدد کرنا اس کا معمول تھا۔ غریبوں اور محتاج سکیںوں

کی خبر گیری اور اعانت - یتیموں کی پرورش - غریب

کنواری لڑکیوں کے نکاح کی فکر اور اس کا سامان

کیا کرتا۔ ملک یونان کے تمام بادشاہ اور امیر اس کی
 عزت کرتے اور تحائف اور زر نقد اس کے لئے بھیجتے
 رہتے تھے۔ اس واسطے وہ بڑی فراخی اور فیاضی
 کے ساتھ اپنی گزر اوقات کیا کرتا اور نہایت امیرانہ
 شان و شکوہ سے رہتا تھا۔ وہ اپنے اہل وطن میں
 بیحد ہر دل عزیز تھا۔ اس کی دولت عام رفاہ کے
 کاموں اور خیرات کے نیک مصرف میں خرچ ہوتی
 تھی۔ تمام ملک اس کے احسان سے حصہ پاتا تھا +
 اہل ایٹھنز نے اس کی ممنونیت کے اظہار اور
 مشکہ گزاری کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک پتھر کی لاٹ
 پر اس کی تعریف اور احسانات کا حال لکھ کر شہر کے
 وسط میں منظر عام پر وہ لاٹ نصب کر دی۔ یہ
 لاٹ ایک اونچے برج پر قائم تھی۔ جس کو تمام شہر
 دیکھ سکتا تھا۔ مگر اچھوں میں بُرے لوگ بھی ضرور
 ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک شریر شخص جس کا
 نام ”ایارادوس“ تھا قوم کی اس کارروائی سے جل
 گیا اور اس نے موقع پا کر وہ لاٹ برج پر سے
 اکھاڑ کے نیچے گرا دی اور توڑ ڈالی۔ ایٹھنز والے
 ”ایارادوس“ کی اس بیجا حرکت پر سخت برہم ہوئے
 اور ایک آدمی ”انطینیوس“ نامی اُس کے درپے قتل
 بن گیا۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر اسے مار بھی
 ڈالا۔ اس کے بعد ایٹھنز کا ایک رہنے والا
 ”اصطفانوس“ نامی بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال

بنا کر ارسطو کی یادگار قائم کرنے میں کوشاں ہوا اور اس نے پہلے کی طرح ایک پتھر کی لاٹ پر دیہی سابقہ عبارت مع ”ایارادس“ کی شرارت کے حال کے لکھی۔ اور اس پر تمام اہل امتحان کی لعنت ڈالی۔ یہ لاٹ بھی اسی برج پر قائم کی گئی۔ جس پر پہلی لاٹ نصب ہوئی تھی +

ارسطو نے ۸۶ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ اس کے شاگردوں میں بڑے بڑے شہزادے اور امیروں کے بیٹے شامل تھے۔ ارسطو کے نامور شاگرد جنہوں نے استاد کا نام روشن کیا یہ تھے ”ٹاؤفرسٹس“ ”اوزیموس“ ”اسکندر اعظم فاتح عالم“ ”ارمینوس“ اور ”اسٹوخولوس“ یہ سب شریف النسب اور عالی خاندان تھے۔ ارسطو کے بعد اُس کے علوم کا وارث اور اس کی مسند درس کا جانشین ”ٹاؤفرسٹس“ قرار پایا۔ یہ ارسطو کا خال زاد بھائی تھا۔ ”ارمینوس“ اور ”اسٹوخولوس“ دونو زبردست حکیم اور ”ٹاؤفرسٹس“ کے دست و بازو تھے۔ ان لوگوں نے منطق و حکمت میں کئی کتابیں خود تصنیف کیں اور اپنے استاد کا نام زندہ کیا + ارسطو نے ایک خرد سال لڑکا اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑی۔ لڑکے کا نام ”نیقوماخس“ تھا۔ وہ بہت کچھ مال و دولت زمین و جائداد۔ لونڈی غلام۔ اور سامان خانہ داری اپنے ترکہ میں چھوڑ گیا تھا۔ ارسطو دراز قامت تھا۔ رنگت سفید تھی۔ ڈاڑھی

گھنٹی اور خوبصورت - آنکھیں چکدار سیاہ مگر کسی قدر
چھوٹی تھیں - دہانہ تنگ - اور سینہ چوڑا تھا - اکیلا
ہوتا تو بہت تیزی کے ساتھ چلتا - اور دوستوں کے
ساتھ آہستہ آہستہ چلا کرتا - مطالعہ اور علمی بحث سے
کوئی وقت نکالی نہ چھوڑتا - اس کو دریا اور باغ کی
سیر کا بہت شوق تھا - خوش آوازی کو بھی پسند
کرتا - علمی بحث اور عام گفتگو میں اصول انصاف
کا پابند رہتا - اپنی غلطی بہت خوشی سے مان
لیا کرتا - اور کھانے پینے میں اعتدال کا بہت
محاذ رکھتا تھا +

ابونصر فارابی

نام و نسب :- ابونصر کنیت - محمد بن محمد
”اوزلغ“ بن طرفان نام - ملک بخارا کے شہر
”فاراب“ کا باشندہ اور نسل کے اعتبار سے فارسی
تھا - فاراب میں ترکوں کی آبادی زاید تھی اسی
لئے وہ ترکوں کی بستی شمار ہوتا تھا - محمد بن
اوزلغ ابونصر کا باپ فوج میں افسر تھا +
ولادت :- ابونصر کی ولادت کا ٹھیک زمانہ
اور اس کی عمر کا کسی تاریخ سے پتا نہیں ملتا -
اندازہ یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی اور تیسری

صدی ہجری کے آخری حصہ میں پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا سال وفات ۳۳۹ ہجری مطابق ۹۵۰ء معلوم ہوا ہے اور قیاس ہے کہ اس نے ساٹھ ستر سال سے کم عمر نہ پائی ہوگی۔ چونکہ جس زمانہ میں یہ عالی مرتبہ حکیم پیدا ہوا اُس وقت فن تاریخ نویسی اپنے ابتدائی دور میں تھا لہذا نہ صرف ابونصر کے بلکہ اکثر زبردست عالموں اور حکیموں کے ابتدائی حالات قطعاً معلوم نہیں ہو سکتے۔

تعلیم و تربیت :- ایک سپاہی کا لڑکا جس قسم کی تعلیم پا سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور پھر ایسے زمانہ میں جبکہ سپہگری اور شمشیر زنی بہت کچھ عزت و احترام کی موجب تھی۔ مگر قیاس یہ ہے کہ بچپن میں اس کو لکھنے پڑھنے کی ابتدائی تعلیم اچھی ملی تھی۔ خواہ ماں باپ نے عمدہ تعلیم و تربیت دلائی ہو یا نہ دلائی ہو۔ قدرۃً اسے علم کا شوق تھا۔ اور خدا نے دماغ صحیح کے ساتھ ذہن و حافظہ کی بھی خاص طاقت اسے مرحمت کی تھی۔ اور وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ کئی دیگر زبانیں جانتا تھا۔ ماں عربی سے جو اس عہد کی درسی اور علمی زبان تھی ناواقف تھا۔ اور اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ والدین نے جو تعلیم اس کو دلائی وہ اعلیٰ تعلیم کی بنیاد نہ تھی۔

بہر حال طبعی شوق کا جذبہ اس کو گھر سے نکال

کہ طلب علم کے لئے سفر پر لے چلا۔ ابونصر مختلف
 شہروں میں گھومتا پھرتا۔ دار السلام بغداد میں وارد
 ہوا۔ جو اُس وقت ایشیا میں سب سے بڑا علمی مرکز
 اور قبلہ علوم تھا۔ یہاں اس نے عربی زبان سیکھنی
 شروع کی۔ اور فکر معاش کے لئے ایک اونٹ ملازمت
 کر لی۔ وہ شہر بغداد میں کسی شاہی باغ کے اندر کام
 کیا کرتا تھا۔ کسی نے محافظ کی خدمت پر مامور بتایا
 ہے۔ اور کوئی باغبان کہتا ہے خیر کچھ بھی رہا ہو۔
 وہ اس زمانہ میں راتوں کو عربی علم ادب اور زبان دانی
 کی کتابیں دیکھا کرتا تھا۔ اور باغ کے چوکیداروں
 کی لالشیبیں اس کا شوق مطالعہ پورا کرنے میں بہت
 کچھ مدد دیا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس نے عربی
 زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ اور ابی بشر متی
 بن یونان سے علم منطق کی تحصیل آغاز کی۔
 ابی بشر کے حلقہ درس میں بڑے بڑے نامی
 گرامی فاضل طالب علم شریک ہوا کرتے تھے۔ اس
 کی علمی تقریر حد درجہ کی برجستہ اور شستہ ہوتی
 تھی۔ باریک سے باریک اور کٹھن علمی مسائل وہ
 ایسے سہل الفاظ کے ذریعے طالب علم کے دل
 و دماغ میں اتار دیتا تھا کہ باید و شاید۔ ابونصر
 کی تصانیف میں جو دلنشین عبارت اور سلیس طرز
 بیان پایا جاتا ہے وہ اسی استاد کے فیض کا
 کرشمہ ہے۔ کچھ عرصہ تک ابی بشر سے تعلیم حاصل

کر کے ابونصر نے خراسان کا سفر کیا اور وہاں حکیم ارسطو کی کتاب ”البرہان“ یوحنا بن جیلان سے پڑھی اور پوری پڑھی +

ابونصر نے فلسفہ کی جو تاریخ بیان کی ہے بلحاظ افادہ اور دلچسپی کے ہم اُس کا اقتباس ذیل میں کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ اُس کا قول ہے کہ ”فلسفہ در اصل یونانی لفظ ”فلاسفی“ کا مُعرب ہے۔ کلمہ ”فلاسفی“ ”فیلا“ اور ”سوفیا“ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ”فیلا“ کے معنی ہیں زیادتی۔ اور ”سوفیا“ کے معنی حکمت۔ لفظ ”فیلوسوف“ اسی ”فلاسفی“ سے مشتق ہے۔ اس کا اصل یونانی تلفظ ”فیلوسوفوس“ تھا۔ عربی لب و لہجہ نے اس کی صورت بدل کر ”فیلوسوف“ بنا لیا۔ اور اس کے معنی ہیں بہت زیادہ صاحب حکمت۔ یہ لقب محض اسی شخص کو ملتا ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصد علم و حکمت کی خدمت اور اس کی ترقی کی کوشش ٹھہرا لیا ہو +

حکیم ارسطو کی وفات کے بعد فلسفہ کی ترقی اور تعلیم ملک مصر کے شہر اسکندریہ میں قائم ہوئی۔ عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس زمانہ میں وہاں حکمت و فلسفہ کے بارہ نامور مُعَلِّم پیدا ہوئے۔ جن میں آخری مُعَلِّم ”اندرونیقوس“ بہت مشہور و معروف آدمی ہوا۔ ”اندرونیقوس“ کے وقت

ہیں اسکندریہ کی فرمانروا ایک ملکہ تھی جسے روما کے نامور قیصر ”آگسٹس“ نے مغلوب اور قتل کیا۔ اور شہر اسکندریہ پر تسلط کر کے قیصر نے وہاں کے بے مثل کتب خانہ کا معائنہ فرمایا۔ اس نے وہاں حکیم ارسطو کی چند کتابیں دیکھیں جو خاص اسی حکیم کے زمانے میں لکھی گئی تھیں۔ یا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے لکھنے اور نقل کرنے کا زمانہ شہنشاہ ”ناؤ فرطس“ کا عہد حکومت تھا۔ دوسرے حکیموں اور فیلسوفوں کی بھی بہت سی کتابیں حکیم ارسطو ہی کے موضوع حکمت پر اس کی نظر سے گزریں۔ اور ان کتابوں کو دیکھ کر قیصر ”آگسٹس“ نے حکم صادر کیا کہ ”جس قدر کتابیں خاص حکیم ارسطو یا اُس کے شاگردوں کے وقت کی لکھی ہوئی ہیں ان کی نئی نقلیں تیار ہوں“ قیصر مذکور کے حکم کی تعمیل ہو چکی تو وہ نقل شدہ کتابوں میں سے بعض نسخے اپنے ساتھ شہر رومنہ الکبریٰ کو لے گیا اور چند باقی متحہ جات اسکندریہ کے دارالعلوم میں رکھے گئے۔ ان کتابوں میں سے جو دارالعلوم اسکندریہ میں رہیں۔ علم و حکمت کے شائقین ان سے نفع اٹھانے لگے اور یہ دارالعلم عرصہ دراز تک رونق پر رہا۔ کتابوں کی نقل کا کام ”اندرونیقوس“ کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور جب اس کام سے فراغت ہو چکی تو ”آگسٹس“ قیصر نے ”اندرونیقوس“ کو ہدایت کی

کہ وہ دار العلم اسکندریہ میں اپنے کسی لائق شاگرد کو مدرس مقرر کر دے اور خود اس کے ساتھ رومۃ الکبریٰ چلے اور وہاں درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کرے۔
 آگسٹس قیصر کی قدردانی اور علم دوستی کے باعث شہر رومۃ الکبریٰ بھی طالبانِ علوم کا قبلۂ مقصود بن گیا۔ اور جس وقت تک سلطنت رومانی کے تخت پر بت پرست قیصر جلوس کرتے رہے۔ اس وقت تک یہ چشمۂ فیض خوب جاری رہا۔ لیکن قیصرۂ روم کے عیسوی مذہب قبول کرتے ہی اساقفہ اور روحانی پیشوایانِ دین نے فلسفہ کی تعلیم خلافِ شرع قرار دے کر رومۃ الکبریٰ کا دار العلم بند کر دیا۔ اب صرف اسکندریہ میں فلسفہ کی تعلیم جاری رہی۔ لیکن وہ بھی ایک خاص حد تک محدود کر دی گئی۔ یعنی مقدس حضرات کے حسبِ احکام صرف ”اشکالِ وجودیہ“ تک منطق کی تعلیم رہ گئی۔ اور اس سے آگے کچھ پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار پایا۔ اور یہ حصہ علم منطق کا درس میں اس لئے رکھا گیا کہ وہ اشاعتِ دین میں مدد دیتا تھا۔

الغرض مذکورہ بالا زمانہ سے ظہور اسلام کے وقت تک منطق کا اتنا ہی حصہ پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا۔ اور اسلام کے وجود کے بعد منطق و فلسفہ کی تعلیم کا مرکز اسکندریہ سے ملک فلسطین کے شہر انطاکیہ میں منتقل ہو آیا۔ انطاکیہ مشرقی رومی شہنشاہوں کا

پایہ تخت اور علم و ہنر کا گھر بنا۔ اور عرصہ تک علم و فن کی دہاں گرم بازاری رہی۔ مگر آخر کار دہاں بھی صرف ایک معلم رہ گیا جس سے دو شخصوں نے یہ علم حاصل کیا۔ اور وہ دونو تحصیل علم کے بعد کتابوں کا ذخیرہ ساتھ لے کر ”انطاکیہ“ سے اپنے اصلی ملکوں کو چلے گئے۔ ان میں سے ایک ملک شام کے مقام ”حران“ کا رہنے والا تھا۔ اور دوسرا خراسان کے صدر مقام شہر ”مرؤ“ کا باشندہ تھا۔ ”مرؤ“ کے فیلسوف سے دو آدمی ”ابراہیم مروزی“ اور ”یوحنا بن جیلان“ مستفید ہوئے۔ اور ”حران“ کے فلاسفر سے ”سراییل اسقف“ اور ”قویری“ نامی دو آدمیوں نے فلسفہ و حکمت کی تحصیل کی۔ فیلسوف ”مرؤ“ گئے دونو شاگردوں میں سے ”یوحنا بن جیلان“ منطق و فلسفہ کی خدمت چھوڑ کر دینی خدمت ادا کرنے میں مصروف ہوا۔ اور ”ابراہیم مروزی“ نے شہر بغداد میں حلقہ درس قائم کیا۔ جس سے ”متی بن یونان“ ایک لائق عالم اور فیلسوف نکلا۔

مگر ان سب علماء کے زمانہ میں منطق کی تعلیم ”اشکال وجودیہ“ ہی تک جاری رہی۔ اس کے بعد کے مسائل درس سے خارج اور ما بعد الاشکال الوجودیہ کے نام سے موسوم رہے۔ البتہ جب منطق و فلسفہ کی تعلیم کا سرشتہ مسلمان علماء اور حکماء کے ہاتھ میں آیا وہ اس متروک حصہ کو بھی پڑھنے اور پڑھانے

لگے۔ مگر یہ بات طالب علم کی استعداد پر منحصر رہی کہ وہ کل حصہ پڑھے یا اپنی خواہش اور فہم کے مطابق اس کا کوئی جُزء۔ چنانچہ ابونصر نے وہ کل حصہ منطق و فلسفہ کا پڑھا تھا جو مدتِ مائے دراز سے خارج از درس قرار دے دیا گیا تھا۔

ابونصر فارابی کی طالب علمی کا زمانہ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کے عہدِ حکومت سے مطابق تھا۔ وہ اپنے وقت میں تمام مسلمان حکیموں اور فیلسوفوں پر سبقت لے گیا۔ اور اپنے زمانے کا یکتا اور بے مثل محقق ہوا۔ اس نے علم منطق کے پیچیدہ اور مشکل مسائل بڑی عمدگی کے ساتھ حل کئے اور اس فن کو عام لوگوں کی سمجھ کے قابل بنانے میں پوری کوشش سے کام لیا۔ اس نے منطق کے مسائل سلیس عبارت کے قالب میں ڈھالے اور ”کندی“ وغیرہ عہدِ اسلام کے حکیموں سے جو باتیں چھوٹ گئی تھیں ان کا تیکہ کیا۔ چنانچہ اس کی تصنیف کی ہوئی کتابیں نہایت صحیح اور صاف طور سے سمجھ میں آتی ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ حکیم ارسطو کے فلسفہ کو اصلی مفہوم میں سب سے پہلے ابونصر ہی نے سمجھا اور پھر اس کو اس قابل بنا دیا کہ دوسرے لوگ بھی اسے سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی وجہ سے اہل منطق اسے معلم ثانی کہتے ہیں اور اس کی

تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں *
 طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے ابونصر نے خود
 درس کا مشغلہ شروع کیا۔ طلباء کا اس کی طرف رجوع
 ہوا۔ اور تصنیفات کا سلسلہ چلا۔ تو اُس کی شہرت
 نے بھی پُر پروازہ کھولے۔ اور اب اس کی رسائی
 دربار شاہی تک ہوئی۔ جس وقت وہ دار الخلافہ
 بغداد سے شہر ”حلب“ کو گیا ہے۔ اس کے نام
 کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ”امیر سیف الدولہ حمدانی“
 نے فارابی کی بہت کچھ قدر و منزلت کی اور معقول
 وظیفہ مقرر کر کے اپنے دربار میں رکھا۔ لیکن فارابی
 کو دنیاوی شان و شوکت سے دلی نفرت تھی۔ اپنی
 ضرورتوں کے لئے چار درم روزانہ وظیفہ کی رقم سے
 لے لیتا اور اسی میں اپنی گزر کرتا۔ گھر اور سامان
 خانہ داری سے اس کو کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ نہ یہ
 خیال تھا کہ لباس عمدہ اور صاف ہو۔ میلے کچیلے
 پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے علم و کمال کی دھن
 میں لگا رہتا۔ اور اسی میں دلی مسرت پاتا۔ سیر و
 سیاحت سے بہت ذوق تھا گویا یہ شعر اسی کے
 حسب حال ہے ۷

درویش رواں رہے تو بہتر

آب دریا سے تو بہتر

اور علمی مسائل پر غور و خوض۔ یا تصنیف و تالیف
 کا مشغلہ رکھنے کے لئے کنارہ آب رواں پر یا

کسی دلکش و پُر فضا باغ و مرغزار میں رہنا اس کو بہت پسند خاطر تھا ۔

فنِ موسیقی میں بھی صاحبِ کمال تھا۔ "تاریخ الحکماء" کے مؤلف نے اس کی ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "صاحب بن عبادہ" ایک علم دوست امیر "ابونصر" سے ملنے کا نہایت مشتاق تھا۔ اس نے سینکڑوں تدبیریں کیں کہ کسی طرح ابونصر اس کے پاس آ جائے۔ ایک دن وہ مجلسِ عیش میں بیٹھا تھا۔ ابونصر بھی وہاں آیا۔ مگر اس طرح کہ نہایت شکستہ حالت میں میلے اور بوسیدہ کپڑے پہنے۔ سر پر چیتھڑے پیٹے۔ اور صورت عجیب و غریب۔ اہلِ محفل دربانوں پر برہم ہوئے کہ اس شخص کو یہاں کیوں داخل ہونے دیا۔ اور ابونصر سے چھیڑ خانی کرنے اور اسے بنانے لگے۔ ابونصر نے ایک باجا اپنی بغل سے نکال کر بجانا شروع کیا۔ سب محفل والے اس ساز کی صدا سن کر ہنس پڑے۔ پھر ابونصر نے پردہ بدل کر بجا یا تو وہ رونے لگے۔ اور تیسرا پردہ بدلنے کے بعد تمام مجلس غافل و مدہوش ہو گئی۔ ابونصر نے ایک باجے پر اپنا نام لکھا اور تحریر کیا کہ "تم کو ابونصر کا اشتیاق تھا۔ وہ آیا تو تم نے اس کی ہنسی اڑائی۔ اب ابونصر تم کو ہنسا، رُلا، اور سُلا کر جاتا ہے۔" پھر مجلس سے رُکھل اور لباس تبدیل کر کے سیدھا بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

اہل محفل دیر تک بے ہوش پڑے رہے۔ اور ہوش میں آئے تو صاحب کمال بربط نواز کو نہ دیکھا۔ اس کا ہنر یاد کر کے ننگین ہوئے۔ مطرب سے کچھ گانے بجانے کی فرمائش کی تاکہ یونہی غم غلط ہو۔ گانے والے نے ساز اٹھایا تو اُس پر سچے لکھا ہوا پایا۔ پڑھنے سے اصلی راز کھلا ”صاحب بن عبادہ“ نے سر پیٹ لیا اور اپنی بدنصیبی پر سخت نادوم ہوا۔ اسی وقت حکیم کی تلاش میں آدمی دوڑائے۔ مگر وہ کہاں ملتا تھا؟ ابونصر کی تصانیف سواسو کے قریب ہیں۔ ان میں ضخیم اور کئی کئی جلدوں کی کتابوں سے لے کر چھوٹے رسائل تک سب شامل ہیں۔ مگر اکثر کتابیں نایاب اور گم ہو گئیں۔ چند گنتی کی سچے اصل عربی زبان میں، اور بعض کا عبرانی ترجمہ، پایا جاتا ہے۔ اس کو حکیم ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کرنے اور سمجھنے میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ ارسطو کی کتاب ”اورغانون“ یعنی ”تنظیم المنطق“ کا اس نے اتنا پیارا ترجمہ کیا ہے کہ وہ کتاب بالکل حل کر کے رکھ دی ہے۔ اس کا قاعدہ تھا کہ ترجمہ لفظی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ معنوی۔ یعنی اصل کتاب کے صحیح مفہوم کو اپنے لفظوں میں اس خوبی کے ساتھ ادا کر دیتا کہ گویا خود اپنا ہی خیال ظاہر کر رہا ہے۔ منطق اور فلسفہ عقلی میں فارابی کو حجت اور امام فن مانا جاتا ہے۔ اس کی ایک نادر کتاب جس میں علوم کا شمار

دیا اور اُن کی تعریف اور موضوع کا ذکر کیا ہے۔
 نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔ اس قسم کی تصنیف
 کا وہی موجد ہے۔ اس سے پہلے کوئی کتاب ایسی
 نہیں لکھی گئی تھی۔ اب اس کتاب کا صرف ایک
 نسخہ اسکوریال (واقع اسپین) کے کتب خانہ میں
 ہے اور کہیں نہیں ہے۔

کتاب ”آراء المدینۃ الفاضلہ“ سیاست مدن اور
 آداب معاشرت و اخلاق وغیرہ میں اس کی بے نظیر
 تصنیف ہے۔ ۱۹۹۵ء میں یہ کتاب بمقام شہر ”لیڈن“
 (ہالینڈ) میں طبع ہوئی۔ اور اب مصر میں بھی چھپ گئی
 ہے۔ اس کے رسالہ فن موسیقی کے چند حصے بھی
 ہالینڈ کے کسی مستشرق عالم نے چھاپے ہیں۔

ابونصر فارابی نے آخر عمر میں سلطان سیف الدولہ
 کے ہمراہ حلب سے دمشق کا سفر کیا اور وہیں
 ۳۳۹ھ مطابق ۹۵۰ء میں فوت ہوا۔ حکیم ارسطاطالیس
 عرف ارسطو کے مسائل کی سمجھ بوجھ میں فارابی کو سند مانا
 گیا ہے۔ وہ مسلمان فیلسوفوں میں بے نظیر اور سب سے
 اعلیٰ پایہ کا شخص ہوا ہے۔ کسی نے فارابی سے
 دریافت کیا تھا کہ ”فلسفہ کے تم زیادہ عالم ہو۔ یا ارسطو
 اس کا زیادہ ماہر تھا؟“ فارابی نے جواب دیا۔ ”اگر
 ارسطو زندہ ہوتا تو میں اُس کی شاگردی پر فخر کرتا
 اور وہ اس بات پر نازاں ہوتا کہ مجھ جیسا شخص
 اس کا شاگرد ہے؟“

ابو ریحان بیرونی

نام و نسب :- محمد - نام - ابو الریحان - کنیت -
احمد خوارزمی کا بیٹا تھا ۔

ولادت :- ۳۶۲ھ میں بمقام شہر خوارزم پیدا
ہوا - اور وہیں تربیت و تعلیم پائی - علوم قدیمہ اور
فلسفہ یونانی میں بڑی دستگاہ حاصل کی اور ریاضی
علوم میں بھی نہایت کمال بہم پہنچایا - شیخ بوعلی سینا
کا ہم عصر تھا اور دونو میں بہت چشمک تھی - اکثر
تحریری مباحثے ہوتے رہتے جن کا کچھ حصہ برٹش
میوزیم لندن میں محفوظ ہے ۔

ابو الریحان خوارزم اور دوسرے اسلامی شہروں میں
فلسفہ و حکمت کے علوم کی تکمیل کر چکا تو یونان
کے عہد قدیم کے حکیموں کا فلسفہ سیکھا اور شوق
علم میں ہندوستان پہنچ کر وہاں کے حکماء کا فلسفہ
اور ان کے علوم بھی حاصل کرنے کا خیال دل کو
بے چین بنانے لگا - مگر اس کا کوئی ذریعہ ہاتھ
نہیں آتا تھا - اس وجہ سے ایک زمانہ تک دربار
خوارزم شاہی میں عزت کے ساتھ حاضر رہا - اور جب
سلطان محمود غزنوی نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ
اپنے درباری فضلا کو ہماری خدمت میں ارسال کر دو -
تو ابی ریحان البیرونی اور ابوالخیر ختار دونو دربار

غزنی میں حاضر ہوئے ۛ

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود کی فتوحات اور حملہ آوریوں کا سلسلہ حدود ہند پر آغاز ہو گیا تھا۔ سرزمین ہند اس کی سطوت سے لرز رہی تھی لیکن اصل یہ ہے کہ محمود کے حملے صرف ہندوستان کے جسم پر ہوتے تھے جو چنڈاں سودمند نہ تھے۔ اس کے دربار میں پہنچ کر ابی ریحان کو اپنی دیرینہ تمنا پوری کرنے کا اچھا موقع ملا۔ اور جس طرح اس کا قدر شناس اور زبردست آقا سلطان محمود تیغ و سنان کی مدد سے ہندوستان کے جسم پر حملہ کیا کرتا تھا۔ ویسے ہی اس میدان علم کے شہسوار نے تیغ خامہ کی مدد سے ہندی علماء و حکماء کے علوم و فنون کا خزانہ ہاتھ میں لانے کی خواہش سے ہندوستان کے دل و دماغ یعنی یہاں کی حکمت و دانش کے ذخائر پر فاتحانہ یورش شروع کر دی ۛ

یہ مخفی نہیں کہ ہندوستان کی پوٹر دھرتی پر بیرونی بلیچھ (ملکش) نرکوں کے قدم آ جانے کے بعد جو کہ یہاں فاتحانہ عزم و ارادوں سے آتے اور صرف مال غنیمت لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے ہندوؤں میں مسلمانوں کی طرف سے سخت عناد پیدا ہو گیا تھا۔ اور ایسے وقت میں کسی بلیچھ مسلمان کا تن تنہا یا چند غیر مسلح ساتھیوں

سمیت ارض ہند میں آنا بڑی ہمت اور دلیری کا کام تھا۔ سرزمین ہند کا ذرہ ذرہ مسلمانوں کا دشمن تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ یہاں کے علماء اپنوں کو بھی عام طور پر اپنے علوم و حکمت کے بتانے میں دریغ رکھتے تھے۔ چہ جائیکہ کسی بیچہ اجنبی کو بتائیں۔ مگر شوق اور طلب صادق نے یہ سب مشکلیں آسان کر دیں اور ابو ریحان تمام مکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو کر زبان سنکرت میں مہارت بہم پہنچا سکا۔

ایک عجیب شخص جس کی ماوری زبان فارسی اور علمی زبان عربی تھی۔ سنکرت سیکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ اور پھر ایسے عہد میں جبکہ غیروں کا اس دیو بانی کے علم سے مشرف بنانا قومی خیانت تصور کی جاتی ہو۔ ایک حیرت افزا بات ہے۔ ابو ریحان اس مرحلہ کو طے کر کے ہندوستان کے قلب میں گھسا اور اس نے یہاں کے بڑے بڑے مقدس علمی مقامات کی سیر کی۔ نہ صرف سیاح کے طریقے پر بلکہ شائق علم و فن کے طور پر۔ یہاں کے تمام علمی خزانوں پر اس نے ہاتھ ڈالا اور ان میں جو بیش بہا جواہر ملے سب چن لئے۔ ہندوؤں کے رسم و رواج اور عام خیالات پر اُس نے ایک غیر طرفدار تماشاخی کے مانند نظر ڈالی۔ اور بے تعلق نکتہ چین کے طرز پر اُن کے اُس زمانہ کے

تمدن اور شایستگی کا مکمل حال قلمبند کر لیا ہے۔
 غرض ایک ہی وقت میں دو مسلمان اولوالعزم
 فاتح ہندوستان پر حملہ کر رہے تھے۔ ان میں سے
 ایک فوج و سپاہ و طبل و علم کے ساتھ مادی
 فوائد کے حصول میں کوشاں تھا۔ اس کا مد نظر
 ہندوؤں کے ایک زبردست راجہ کی ان حملہ آوروں
 کا انتقام تھا جو اس نے اسلامی ممالک پر کی تھیں
 اور حقوق ہججاری کی پروا نہ کر کے محمودی حدود کو
 اپنا جولانگہ بنایا تھا۔ اور دوسرا فاتح سنان قلم لے کر
 ہندوستان کے قدیم فلسفہ و تہذیب اور یہاں کے
 اخلاق و عادات کی معلومات کا قیمتی خزانہ لوٹنا چاہتا
 تھا۔ اس کا عمل خاموشی کے ساتھ ہوتا رہا۔ بیرونی
 نے پنجاب و سندھ کی خوب سیر کی۔ بنارس و کشمیر
 تک تو اس کی رسائی کا پتا نہیں لگتا۔ لیکن مالوہ
 اور راجپوتانہ کے اہم مقامات اس نے ضرور دیکھے۔
 چنانچہ وہ اجیر تک گیا اور وہاں کے مندر میں
 پٹجاری بن کر مقیم رہا ہے۔

ابی ریحان ہندوؤں کا صرف شاگرد ہی نہیں
 بنا بلکہ اس نے ان کو اپنا شاگرد بھی بنا کر اُستادی
 کا حق ادا کیا۔ حیرت اور سخت حیرت ہوتی ہے
 کہ ایسے پُر شور زمانہ میں جیسا کہ بیرونی کا عہد
 تھا۔ اسے ہندوستان میں یہ کامیابی کیونکر نصیب
 ہوئی۔ مگر جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبردست

فیلسوف اور علم و حکمت کا متلاشی تعصب اور تنگدلی کی قید سے بالکل آزاد تھا۔ تو یہ حیرت دفع ہو جاتی اور عقل اس کی کامیابی کو خود ہی جائز تسلیم کر لیتی ہے۔ بہر حال ابی ریحان یادداشتیں مرتب کرتا رہا۔ اور عرصہ دراز کے چشم دید حالات اور تحقیقات علمی کا ذخیرہ ہمراہ لے کر بالآخر غزنی کو واپس گیا۔ جہاں اپنے قدردان آقا سلطان محمود کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد اس نے ”کتاب الہند“ لکھی۔ اور یہ عربی زبان میں ہندوستان کے جغرافیہ تاریخ۔ علوم و فنون۔ اور مذاہب وغیرہ کے متعلق پہلی تصنیف تھی۔ جس کو موجودہ زمانہ کے محققان یورپ بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس مسلمان عالم کی محنتوں کی داد دیتے ہیں۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں مسعود اور محمد میں ملک و سلطنت کے حصول پر نزاع ہوا۔ اور جنگ و جدل کی نوبت آئی۔ محمد اپنی فوج کی ناکحرامی کے باعث گرفتار ہو کر بھائی کے سامنے پیش ہوا اور اندھا کر دیا گیا۔ بیرونی نے یہ پُر آشوب زمانہ گوشہ نشینی اور تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں بسر کیا۔ اور جب سلطان مسعود بن محمود تخت حکومت پر بے غل و غش قابض ہو بیٹھا تو ابی ریحان البیرونی بھی اس کے زیر سایہ آگیا۔ اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

ابو الريحان نے ۱۰۲۵ھ میں ۷۹ سال کی عمر
پاکر بمقام شہر غزنی دُنیا سے عالم آخرت کی طرف
سفر کیا۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون ✽
تصانیف :- ابو الريحان بیرونی کی تصانیف حسب
ذیل ہیں :-

علوم ریاضیات اور ہیئت میں کئی ایک قابل قدر
کتا ہیں تصنیف کی ہیں۔ علوم ہیئت، نجوم، اور
جغرافیہ میں اس کی کتاب ”القانون المسعودی“ بڑے
اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ ابو الريحان نے یہ کتاب
خاندان حکومت غزنی کے چوتھے تاجدار سلطان مسعود
بن محمود بن سبکتگین کے نام سے معنون کر کے
۱۰۲۵ھ میں لکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۰۲۵ھ میں ایک
جرمن اورینٹلسٹ کی توجہ سے طبع ہوئی۔ اس جرمن
عالم نے کتاب مذکور کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی
کیا تھا جو لندن میں چھپا ہے۔ اس کتاب سے
مشہور مسلمان جغرافیہ نویس ”اسمعیل ابو الفدا“ نے
اپنی کتاب ”تقدیم البلدان“ میں بہت کچھ مدولی ہے ✽
ابو الريحان کی ایک اور کتاب ”الآثار الباقیہ عن
القرود الخالیہ“ علم نجوم و تواریخ میں نادر المثال
ہے۔ ”الارشاد فی احکام النجوم“ نجوم میں۔ ”الجواهر
فی الجواهر“ ”العجائب الطبیعة و الغرائب“ فن طبیعیات
میں۔ کتاب ”المصیلة“ طب میں۔ ”مقالبہ الہیئت“
علم فلکیات میں۔ اور ایک کتاب ”دائرہ کے خط منحنی

کے خواص اور اس سے وٹروں کے استخراج“ میں۔
یہ سب اس کی دماغی محنتوں کے نتائج اور اس کے
علم و کمال کی یادگاریں ہیں ۔

اس نے ہندوستان قدیم کے جغرافیہ میں ایک
کتاب ”عجائب الہند“ نامی لکھی ہے۔ اس میں جغرافیہ
ریاضی کے متعلق علوم ہندسہ اور فلکیات کی بہ کثرت
معلومات فراہم کر دی ہیں۔ جرمن پروفیسر ”ساخاؤ“
کی توجہ سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ بمقام لندن طبع
ہوئی تھی۔ پروفیسر ”ساخاؤ“ نے اس پر ایک دیباچہ
لکھا ہے۔ جس کا اہم اور دلچسپ اقتباس ذیل میں
درج کیا جاتا ہے۔ اس اقتباس میں صرف ضروری
جملے اور فقرے لئے گئے ہیں اور زوائد کو حذف
کر دیا گیا ہے۔ وہ کتنا ہے :-

”برہمنی ہندوستان پر عربی زبان میں کسی کتاب
کا پایا جانا۔ شاذ و نادر بلکہ خلافت عباسیہ معلوم ہوتا
ہے۔ اس سے بڑھ کر حیرت انگیز امر اور کیا ہوگا
کہ ایک قرآن کی زبان کا عالم اور مصنف ایسا وسیع
النظر ہو کہ ہندوؤں کے خیالات کی تحقیقات اپنا مد نظر
بنائے اور اس کے لئے ان کے ملک میں پہنچ کر
ان کے حالات کو غور کی نظر سے دیکھ کر ان پر
اپنے خیالات کا اظہار کرے اور ایک مستقل کتاب
تصنیف کر دے۔ عہد اول کے مسلمان عرب محض
تلوار لے کر اشاعت مذہب کو بخوبی جانتے تھے۔

اور علوم قدیمہ کے شوق جستجو سے بے بہرہ تھے۔
 نہ مفقود ممالک کی تاریخ قدیم کے تلاشی ہوتے تھے۔
 ان میں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوا جیسا کہ کتاب الہند
 کا مصنف ہے۔

”اگرچہ اس کو اسلام کی فوقیت کا یقین کامل تھا۔
 تاہم ہندوؤں کی بیدار مغزی اور ان کے علوم کا مزاج
 تھا۔ اس کا عمل اس اصول پر تھا کہ جو لوگ ہندوؤں
 سے میدان علم میں زور آزمائی کرنا اور ان سے انصاف
 و مساوات کا سلوک فرمانا چاہیں۔ وہ پہلے ہندوؤں
 کے رسم و رواج اور عام حالات و خیالات سے
 واقفیت حاصل کریں۔“

”اس کتاب کا مضمون اس وقت کے مسلمانوں کے
 لئے بالکل نہیں تو بہت کچھ ضرور نیا تھا۔ ہمارا مسلمان
 مصنف کسی ملک کا بچپن نہیں بیان کرتا۔ وہ بالکل
 متعصب نہ تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے
 اپنے مضمون پر بڑے شوق سے محنت کی ہے۔ اور
 کبھی حصول علم کے موقع پر محنت، صرف وقت،
 یا سچی بات کا پتا لگانے میں کمی نہیں کی۔ اور

لہ مسلمانوں کو اس اعتراض اور خیال سے بے گناہ چاہئے۔
 یورپین علماء کا مبلغ علم اسلام اور پیروان اسلام کی نسبت
 نہایت محدود اور مغربی متعصب مصنفین کی تصانیف تک
 ہی منحصر ہے اس لئے وہ ایسا لکھنے اور کہنے میں معذور
 سمجھے جائیں تو بہتر ہے۔“

اگرچہ مسلمان تھا۔ تاہم غیر مذہب ہندو فیلسوفوں کے ساتھ ہمدردی، اور اُن کے مسائل کو پسند کرتا تھا۔ اُس کا انصاف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ پڑھنے والا کتاب کے بہت سے صفحے پڑھنے پر بھی یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اس کا مصنف کوئی مسلمان ہے۔ اگر مسلمان سچے غرور سے اس کتاب کو اپنے عربی علم ادب کے آسمان کا ستارہ سمجھیں۔ تو ہندوؤں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ ایک سچے اور لائق آدمی کے ان کے آبا و اجداد کی دُست تصویر کھینچنے پر فخر کریں۔ گو بعض بیانات سے اُن کو اتفاق نہ ہوگا۔ چند اعتراضات انہیں چیں۔ بجبیں بنا دیں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ فوراً یہ بھی اقرار کر لیں گے کہ مصنف کا اصلی مقصد سچائی حاصل کرنے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور یہ بھی ضرور خیال کریں گے کہ اُس نے ان کی تہذیب کی از حد تعریف بھی کی ہے۔

ابو الريحان بیرونی اس وجہ سے کہلاتا ہے کہ ”بیرون“ ملک سندھ کا ایک شہر تھا۔ اور ابو الريحان وہاں عرصے تک سکونت رکھنے کی وجہ سے اسی کی طرف منسوب ہو گیا۔ تصنیف و تالیف کے سوا کوئی کام دل کو پسند نہ آتا۔ صرف دو دن سال میں معاش کی فکر کے لئے خاص تھے۔ باقی تمام اوقات مطالعہ۔ تصنیف اور تالیف میں بسر

ہوتے۔ ہر وقت قلم ہاتھ میں۔ آنکھیں کتاب پر۔
اور دل فکر میں رہا کرتا ہے۔
اس کا قول ہے کہ:- ”جیسے آج کی ضرورت آج
پوری ہو جاتی ہے ویسے ہی کل کی ضرورت کل پوری
ہو رہیگی۔“ جس وقت وہ اپنی کتاب ”القانون للسعودی“
لکھ رہا تھا۔ سلطان نے ایک ہاتھی پر روپیوں کے
توڑے لدوا کر بطور انعام اس کے پاس بھیجے۔
ابو ریحان نے اس روپیہ میں سے صرف ایک دن
کا خرچ خوراک رکھ لیا اور باقی تمام روپیہ واپس کر دیا۔
اللہ نے استغنا!!

ابو ریحان کا ایک عجیب و غریب قصہ کسی مورخ
نے یہ لکھا ہے کہ ایک دن سلطان محمود غزنوی
شاہی محل سرا میں کسی ایوان کے اندر بیٹھا تھا۔
اس ایوان میں چار دروازے تھے۔ سلطان کو نہیں
معلوم کیا خیال آیا کہ اس نے ابو ریحان سے سوال
کیا۔ بتاؤ میں کس راستے سے ایوان کے باہر
جاؤنگا؟ ابو ریحان نے ارتفاع طالع پر غور کر کے
منجھم کا حساب لگایا اور ایک پرچہ کاغذ پر کچھ
لکھ کر وہ پرچہ سلطان کے تکیہ کے نیچے رکھ دیا
اور بادشاہ سے عرض کیا کہ ”آپ جس دروازہ سے
مضی ہو اُدھر سے باہر جائیے۔ یہ بالکل آپ کی
خوشی پر منحصر ہے۔“ سلطان نے اسی وقت حکم دیا
کہ ایوان کی مشرقی دیوار توڑ کر راستہ بنایا جائے

اور جب سلطان اسی راہ سے باہر چلا گیا تو اس نے ابو ریحان کا لکھا ہوا پرچہ دیکھا اس میں بجنسہ وہی حکم درج تھا جو کہ وقوع میں آیا۔ یہ دیکھ کر سلطان نے حکم دیا کہ ابو ریحان کو دیوار قلعہ پر سے خندق میں پھینک دیا جائے۔ شاہی خادموں نے اس حکم کی تعمیل کر دی۔ لیکن حکیم نے وہاں پہلے سے ایسا حکمت کا جال بچھا رکھا تھا کہ باوجود اس قدر زور سے گرنے کے اسے کوئی صدمہ نہیں آیا۔ اور نہ زمین پر گرنے سے اسے چوٹ لگی۔ سلطان کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ سخت متحیر ہوا اور اس نے ابو ریحان سے اس کی نسبت دریافت کیا کہ ”کیا وہ پہلے ہی اس بات کا علم رکھتا تھا؟“ حکیم نے ایک غلام کو اشارہ کیا کہ ذرا اس کی تقویم (جنتری) اٹھا لائے اور کتاب آجانے پر اس دن کی تحویل سلطان کے ملاحظہ میں گزران دی۔ سلطان نے دیکھا کہ تمام واقعہ جو اس وقت پیش آیا بجنسہ تقویم میں لکھا ہے۔ اور یہ دیکھ کر وہ مع تمام ارکان دولت کے حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گیا۔



(بو علی سینا)

ابو علی الحسین نام - عبد اللہ بن حسن بن علی بن سینا کا فرزند - حکماء اسلام میں بے مثل فاضل گزرا ہے - باعتبار علم و تبحر معلم اول و ثانی کے بعد تیسرے مرتبہ پر تھا - اپنے زمانے کا شیخ اور امام فن تسلیم کیا گیا - اور شیخ الرئیس کے لقب سے ملقب ہوا +

پیدائش اور ابتدائی تعلیم :- شیخ کا باپ "عبد اللہ" بخارا کے ایک گاؤں "خرمیش" میں تحصیلدار تھا - سلطان نوح بن منصور فرمانرواے بخارا کی سرکار سے اس کا تعلق تھا - اور اسی گاؤں کے پاس "افشنہ" نامی دوسرے گاؤں میں عبد اللہ نے اپنی شادی کی - شیخ کی ماں کا نام "ستارہ" تھا - اس بیدار بخت عورت کے شکم سے عبد اللہ کے دو بیٹے حسین اور محمود پیدا ہوئے - حسین بن عبد اللہ تو حکیم الاسلام شیخ الرئیس ابو علی الحسین بن سینا بنا - اور محمود نے کوئی نام و نمود نہ پایا - شیخ کی ولادت ۳ صفر ۳۷۵ھ کو ہوئی تھی - جب اس کی عمر تعلیم پانے کے قابل یعنی پانچ سال کی ہوئی - باپ نے گاؤں کا رہنا ترک کر کے شہر بخارا میں سکونت اختیار کی -

تاکہ ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکے ۔

سب سے پہلے قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کا استاد حسین کے لئے مقرر ہوا ۔ پانچ سال کے عرصہ میں ہونہار لڑکا قرآن شریف ۔ صرف و نحو وغیرہ زبانہانی کے علوم میں خوب ماہر اور طاق ہو گیا ۔ شیخ کا باپ عبد اللہ ۔ اسمعیلیہ فرقہ کا پیرو تھا ۔ اور اسی طرح شیخ کا بڑا بھائی محمود بھی ۔ ان دونوں باپ بیٹوں میں اکثر مذہبی گفتگو ہوا کرتی تھی ۔ جس کو شیخ بھی سننا اور سمجھنا ۔ لیکن اس کا دل باپ اور بڑے بھائی کے عقائد کو قبول نہیں کرتا تھا ۔ اگرچہ باپ اور بڑے بھائی نے حسین کو اپنا ہم خیال بنانا چاہا ۔ مگر وہ کسی طرح بھی ان کی بات نہ مان سکا ۔

حسین اپنے باپ سے لگا ہے ماسے فلسفہ حساب ۔ اور مساحت وغیرہ علوم کا ذکر سن کر ان کا شوق اپنے دل میں پاتا ۔ ”عبد اللہ“ نے فرزند ارجمند کا میلان معلوم کر کے اس کو ایک بنری فروش کے پاس بھیجنا شروع کیا ۔ جس کو ”محمود مساح“ کہا جاتا تھا اور وہ ریاضی اور مساحت کا خوب ماہر تھا ۔ حسین نے چند روز محمود مساح کی شاگردی کر کے علوم ریاضیہ اور مساحت کے اصول معلوم کر لئے اور اپنی طبیعت کی تیزی سے جو باتیں دوسرے آدمی برس اور مہینوں میں بمشکل سیکھ سکتے وہ دنوں اور گھنٹوں میں سمجھ لیں ۔ آخر

استاد کو معلوم ہوا کہ شاگرد اس کی مدد کا محتاج نہیں رہا بلکہ وہ اسی کو اور تعلیم دے سکتا ہے۔ ابھی حسین اس استاد کے پاس پڑھتا ہی تھا کہ بخارا میں ایک لائق عالم اور فیلسوف ”ابو عبد اللہ نائلی“ آگیا۔ حسین کے باپ عبد اللہ نے ہونہار بیٹے کی تعلیم کی خواہش سے ابو عبد اللہ کو خاص اپنا مہمان بنایا اور نہایت عزت و احترام سے اس کی خدمت میں مشغول ہوا۔

اعلیٰ تعلیم :- اس سے پہلے کہ حسین ابو عبد اللہ نائلی کے زیر تعلیم آئے وہ بخارا کے ایک مشہور فقیہ ”اسماعیل زاہد“ علم فقہ پڑھتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت دستور تھا حسین نے اس علم میں اچھا کمال حاصل کر لیا تھا۔ نائلی کے پاس اس نے منطق و فلسفہ کا درس لینا شروع کیا اور سب سے پہلے منطق کی کتاب ایسا نحو جی آغاز کی۔ حسین نے پہلے ہی سبق میں استاد کے سامنے ایسی لاجواب تقریر کی کہ استاد دنگ رہ گیا۔ نائلی نے حسین کے باپ اور اپنے ہنر شناس میزبان عبد اللہ سے کہا کہ تمہارا یہ فرزند یگانہ دہر ہوگا۔ اس کو علم کے سوا کسی اور کام میں نہ ڈالنا۔ پھر اس نے بڑی توجہ سے حسین کو تعلیم دی۔ حسین نے تھوڑے ہی زمانے میں منطق کے ظاہری مسئلے اور ابتدائی نکتے نائلی سے پڑھ لئے۔ اس علم کی اندرونی باریکیاں خود استاد کو بھی معلوم نہ تھیں۔ اور حسین کا دل حقیقت

کی تلاش کا دیوانہ تھا لہذا اس نے اپنے طور پر فن منطق کی متن کی کتابیں اور ان کی شرحیں دیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا +

اقلیدس کے پڑھنے میں بھی حین کا یہی طریقہ رہا۔ پہلے مقالہ کی پانچ پہلی شکلیں تو اس نے استاد سے پڑھیں۔ اور باقی تمام کتاب خود حل کر ڈالی۔ پھر کتاب مجسطی کی نوبت آئی اور اس میں بھی شاگرد ہی استاد کی حق ادا کرتا رہا۔ حین کی اعلیٰ تعلیم یہیں تک پہنچی تھی کہ نائلی بخارا سے چلا گیا۔ اس کے بعد حین نے آپ ہی علوم طبیعیات اور الہیات کا مطالعہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ فلسفہ میں کامل استعداد ہو جانے پر علم طب کا شوق دل میں گدگدی پیدا کرنے لگا +

امیر نوح بن منصور سامانی فرمانرواے بخارا کا درباری طبیب "حسن بن نوح القمری" اس وقت بخارا میں سر آمد اطبا مانا جاتا تھا وہ جالینکوس اسلام محمد بن زکریا رازی کا ہمعصر تھا۔ حین اس کے مطب میں حاضری دینے اور معالجات کا معاہدہ کرنے لگا۔ اکثر درس میں بھی شریک ہوتا اور نہایت غور سے طبی مسائل کو مٹا کرتا۔ خدا دلو ذہن و طبیعت کی مدد سے بہت جلد حین کو اس فن میں وہ کمال حاصل ہو گیا کہ بڑے بڑے فاضل طبیب اس کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرنے لگے۔ اب اس نے معالجہ بھی شروع کیا۔ اور پیچیدہ سے پیچیدہ امراض

میں نہایت کامیاب علاج کرتا رہا +
علم فقہ کا شوق اور مناظرہ کا چسکا اب تک
حسین کی طبیعت میں باقی تھا۔ وہ دوسرے علوم
میں مشغول ہو کر ادھر سے غافل نہیں ہوا بلکہ
روز بروز اس کو اور جلا دیتا گیا۔ غرضیکہ سولہ سال
کی عمر میں تمام مروجہ علوم و فنون میں اس کو
کمال حاصل ہو گیا +

شوق مطالعہ :- مطالعہ کا وہ شوق تھا کہ
راتوں کو جاگ کر بسر کر دیتا۔ نیند سناپی تو پانی
پی کہ تازہ دم ہو جاتا۔ اور پھر کتاب پر جھک
پڑتا۔ اگر کچھ نیند کی جھپکی آ بھی جاتی تو وہی
مسائل جن پر بیداری میں غور کر رہا تھا خواب
میں خود بخود حل ہو جایا کرتے۔ حسین نے اسی
طرح مطالعہ اور شوق کی مدد سے جملہ علوم میں
کمال حاصل کیا۔ اور پھر بحر اس کے کہ آخر عمر
تک مشق اور تجربہ سے علم میں پختگی تو ضرور
آتی گئی اور کوئی نیا اضافہ اس کی کتابی معلومات
میں نہیں ہوا +

ایک مرتبہ حسین نے علم الہیات میں کتاب
مابعد الطبیعہ کا مطالعہ کیا۔ اس کی سمجھ میں نہ
آیا کہ مصنف کیا کہتا ہے۔ دو بارہ پڑھا۔ پھر
نہ سمجھا۔ آخر چالیس مرتبہ ساری کتاب پڑھی کہ
وہ بالکل حفظ ہو گئی۔ مگر سمجھ میں کچھ بھی

نہ آیا تو مایوس ہو کر اُسے رکھ دیا۔ چند روز بعد اتفاق سے کتب فروشوں کے بازار میں جانکلا۔ ایک دلال نے ایک کتاب دکھائی۔ وہ بھی علیہ السلام کے متعلق تھی۔ شیخ کا دل اس علم کی طرف سے سرو ہو چکا تھا۔ اس نے خریداری سے انکار کر دیا۔ دلال نے کہا۔ ”کتاب کا مالک غرض مند ہے سستی ملیگی۔ لے لو! صرف تین درہم قیمت ہے۔ حین نے خرید لی اور گھر لا کر دیکھا تو وہ علم مابعد الطبیعتہ کے بارہ میں ابونصر فارابی کی کتاب تھی۔ اس کے پڑھنے سے سابقہ کتاب کا مطلب بھی حل ہو گیا۔ اور شیخ کو اس کامیابی پر اتنی خوشی ہوئی کہ بہت سا روپیہ غربا و مساکین کو خیرات میں بانٹا۔

دربار میں رسائی :- حسین بن عبد اللہ بن سینا کے مطالعہ سے گہری دلچسپی رکھنے اور علوم و فنون میں طاق ہونے کا ذکر عام و خاص کی زبانوں پر جاری تھا۔ اور بخارا میں بہت کم لوگ اس سے ناواقف رہ گئے تھے۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں سلطان نوح بن منصور سخت بیمار ہوا۔ دربار اور ملک کے نامور طبیب علاج کر تھکے۔ بیماری کسی طرح کم نہ ہوئی اور صحت حاصل نہ ہو سکی۔ آخر کار درباری اطباء نے سلطان سے شیخ کا بھی تذکرہ کیا۔ اور وہ معالجہ کے واسطے بلوایا گیا۔ شاید کارکنان قضا و قدر نے شیخ کو عزت و نعمت و دیوی بخشنے

کا یہی ذریعہ مقرر کیا تھا۔ اس کے علاج سے سلطان کو چند دن میں کامل شفا ہو گئی۔ پھر تو خلعت و انعام کا مینہ برس پڑا اور شیخ مالا مال ہو کر عزت و حرمت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ شاہی نظر عنایت اس کے حال پر مبذول تھی۔ جیسے جیسے اس کے علمی جوہر کھلتے جاتے تھے یہ دربار میں سب اہل علم پر سبقت پاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ علما اور حکما میں سب پر فائز اور سلطان کا خاص انخاص مقرب بن گیا۔ شاہی کتب خانہ کی کنجیاں اس کے سپرد کر دی گئیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کی عام اجازت ملی۔ شیخ نے نادر و نایاب کتابوں کے مطالعہ سے اپنی وسعت نظر بڑھانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ جن کتابوں کے متعدد نسخے تھے ان میں سے ایک ایک اپنے کتب خانہ کے لئے لے لیا اور جن کا ایک ہی نسخہ ملا ان کی نقلیں لے کر اپنے کتب خانہ میں داخل کیں۔ اور دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ بہت کچھ فائدہ اس کتب خانہ سے اٹھا سکا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں شاہی کتب خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ تمام قیمتی کتابوں کا ذخیرہ برباد ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ شاہی درباروں میں جن کو زیادہ تقرب ہو ان کے دشمن بھی بہت ہو جاتے ہیں۔ شیخ کے بدخواہوں نے اس واقعہ

کے بعد سلطان سے چٹلی کھاٹی کہ شیخ نے کتابوں کے
لاچ میں یہ کتب خانہ ضائع کیا ہے اور عمدہ عمدہ
کتابیں اس جیلہ سے اپنے گھر لے گیا ہے۔ لیکن
سلطان نوح بن منصور ایک ذی علم اور علم دوست
بادشاہ تھا۔ اس نے ان چٹل خوروں کی خوب خبر
لی۔ اور شیخ کا مرتبہ پہلے سے دو چند بڑھا دیا۔
باپ کی رحلت اور گرفتاری مصائب :-
سلطان نوح بن منصور کے دربار میں رسائی پانے کے
چند روز بعد شیخ کا باپ عبد اللہ ہونہار فرزند کی ترقی
و عظمت اور علمی شہرت کا معائنہ کر کے عالم آخرت کو
سدھار گیا۔ اور شیخ کے لئے دنیا کے دھندوں کا جھگڑا
چھوڑ گیا۔ اب شیخ کی زندگی اس قدر مطمئن نہیں
رہ گئی تھی کہ علمی مشاغل کے سوا کوئی اور کام اس
کا وقت نہ لے سکے۔ دربار داری کا کام۔ اور گھر کے
تفکرات۔ یہ دو باتیں اس کو کھینچ تان کر سچھ دیر کے
واسطے علمی دنیا کے باہر لے آیا کرتی تھیں۔ تاہم
علم اور عزت و وجاہت کی زندگی میں فرق نہ آیا تھا۔
کیونکہ سلطان نوح بن منصور کی قدر دانی اور وطن کی
سکونت نے اسے مصیبت اور آوارہ گردی سے بچا
رکھا تھا۔ لیکن یہ مطمئن حالت بہت جلد بدلنے والی
تھی۔ اور زمانہ اس کی سوانح عمری میں ایک افسوسناک
باب اضافہ کرنے والا تھا۔ جو یوں شروع ہوا کہ
سلطان نوح ابن منصور کی وفات کے بعد ہی اس

کے خاندان حکومت پر تباہی آئی۔ اگرچہ اس کا بیٹا منصور بن نوح کچھ روز تخت حکومت پر شکن رہا۔ مگر ملک پر غدر برپا ہو گیا تھا۔ اور امارت کی حالت ابتر تھی۔ اس لئے غزنی کے غنیم ملک پر قابض ہو گئے اور شیخ کو کسی اور مقام کی تلاش ہوئی جہاں وہ اپنی زندگی حسب دلخواہ آرام سے بسر کر سکے۔ شیخ نے بخارا کو خیرباد کہا اور ”گرگانج“ کی طرف چلا جہاں خوارزم شاہ کی حکومت تھی اور اس کا فاضل وزیر ابو الحسین السہلی علما و فقہا کی سرپرستی کے لئے مشہور زمانہ ہو رہا تھا۔ ابو الحسین خود ایک زبردست فقیہ تھا اور اس کی مجلس میں علم فقہ کے مسائل پر اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ شیخ ابو علی الحسین بن سینا اس وقت تک فقہ کی وضع میں رہتا اور اس علم سے ذوق رکھتا تھا۔ وہ وزیر مذکور سے ملنے گیا اور علماء کا معمولی لباس پہن کر اس کی مجلس میں داخل ہوا۔ شیخ کی عمر اس وقت اکیس بائیس سال سے زائد نہ تھی۔ اس کی ظاہری حالت پر کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ ایسا بے مثل فاضل اور یگانہ وقت ہے۔ وزیر کی مجلس میں ایک گوشہ میں بیٹھا رہا۔ وزیر نے اس کی حسب حیثیت تعظیم و تکریم بھی نہ کی۔ شیخ پہلے تو چپ رہا۔ مگر جب مجلس میں سناٹا چھا گیا اور سب لوگ چلے گئے تو اس نے وزیر کے روبرو آکر فقہ کے باریک مسائل چھیڑ دئے اور ایسی لالچواب

تقریریں کیں کہ وزیر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر تو وزیر نادم ہو کر مسند سے اتر آیا اور شیخ کو کمال عزت کے ساتھ اپنے برابر بٹھا کر نام و نشان دریا بنا کر لے گا۔ شیخ نے نام و مقام کا پتہ دیا تو وزیر خوشی سے اچھل پڑا اور اپنی قسمت پر نازاں ہوا کہ ایسا بینظیر زمانہ عالم اس کے زیر سایہ آیا ہے۔ وزیر ابوالحسین نے خوارزم شاہ سے کہہ کر شیخ کا معقول وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اور دربار میں حاضر رہنے کی خدمت سپرد ہوئی +

خوارزم شاہ کا دربار اس وقت بڑے بڑے کالمان زمانہ کا مرجع تھا۔ ابوالخیر خمار۔ ابوسہل مسیحی۔ اور ابوسحان البیرونی وغیرہ یکتاے دہر عالم و ماں موجود تھے۔ شیخ کے داخل دربار ہونے سے اور بھی رونق دربار بڑھی اور کچھ زمانہ بعد شیخ کا مرتبہ تمام درباری حکما سے بڑھ گیا۔ شیخ تو سمجھا تھا کہ اب یہاں آرام سے رہیگا۔ لیکن زمانہ کہتا تھا کہ آرام کہاں۔ تجھکو بہت خاک چھاننی اور مصیبتیں جھیلنی پڑیگی +

سلطان محمود غزنوی کا تیر اقبال وسط ایشیا کی سرزمین پر تباہاں تھا۔ اس کے فتوحات نے تمام امرا اور سلاطین کے کانوں میں اس کا حلقہ اطاعت ڈال دیا تھا۔ سلطان محمود سے لوگوں نے شیخ بوعلی سینا کے عقاید مذہبی کے متعلق کچھ شکایت کی اور سلطان نے اس کو اپنے دربار میں بلوا کر راہ راست

پر لانے یا سزا دینے کا ارادہ کیا۔ خوارزم شاہ سے ایک معزز افسر کی معرفت اُس کے درباری حکما کو طلب کیا۔ خوارزم شاہ کو سلطانی قاصد کے آنے کی خبر اور اس کی غرض آمد پہلے سے معلوم ہو گئی تھی۔ چونکہ اُس میں سلطانی حکم سے انکار کی تاب نہ تھی اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ بے نظیر علما و حکما کی جان جائے یا انہیں اذیت پہنچے لہذا اس نے شیخ اور دیگر حکما کو خبر کر دی۔ اور ان سے کہا کہ تم لوگ اپنی جان بچاؤ میں تمہاری کوئی حمایت نہ کر سکو نگا۔

شیخ بوعلی سینا اور ابوسہل مسیحی اپنے دل میں سمجھ گئے کہ یہ سب آفت انہی کے سر آئیگی۔ دونو روپوش ہو کر بھاگے۔ راستہ میں طوفانِ باد آیا۔ گرم تو پٹی۔ پیاس کی وہ شدت ہوئی کہ ابوسہل تو فوت ہو گیا۔ مگر شیخ اقتاں و خیزاں بھاگتا ہوا کئی جگہ گیا۔ جہاں پہنچتا اپنی گرفتاری کے اعلان کا حال سناتا اور پھر بھاگتا۔ اخیر میں ارادہ کیا کہ جرجان جائے۔ وہاں کا حاکم قابوس بڑا علم دوست تھا۔ شیخ بشکل تمام بے سروسامانی کی حالت میں جرجان پہنچ گیا۔ اور گزر بسر کے لئے مطب کرنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے علاج کا شہرہ سارے شہر میں ہو گیا۔ اور شیخ کو اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ وہ اچھا مالدار بن گیا۔ لیکن اب تک دربار میں اس کی رسائی نہیں ہو سکی تھی اور نہ کسی کو اس کا حال معلوم تھا کہ

یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے *
 اتفاق سے امیر قابوس کا بھانجا کچھ عرصہ سے سخت
 بیمار تھا۔ کسی طبیب کے علاج سے صحت نہ تو کیا مرض
 میں افاقہ کی بھی صورت نہیں نظر آئی تھی۔ شیخ کا
 تذکرہ بھی اڑتے اڑتے دربار تک پہنچ گیا اور قابوس
 نے اُس کو بلوایا۔ شیخ نے مریض کو دیکھا۔ ایک خوش رو
 نوجوان جس کی عمر بیس سال سے زائد نہ تھی بالکل زار
 و نزار بستر پر پڑا تھا۔ نبض وغیرہ سے معلوم ہوا
 کہ جسمانی بیماری کوئی نہیں۔ خیال آیا کہ ضرور اس کو
 قلبی اور روحانی مرض ہوگا۔ سوچ کر شیخ نے کہا: ”کوئی
 آدمی بلوایا جائے جو اس شہر سے خوب واقف ہو۔“
 وہاں تو حکم کی دیر تھی۔ فوراً اسی طرح کا ایک آدمی
 حاضر کیا گیا۔ حکیم (شیخ) نے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ
 دیا اور اس شخص سے کہا کہ شہر کے محلوں اور گلی
 کوچوں کے نام بیان کرے۔ ایک محلہ کے نام پر
 مریض کی نبض میں عجیب عجیب حرکتیں پیدا ہوئیں۔
 اس وقت حکیم نے اس شخص سے کہا کہ ”اس محلہ کے
 تمام گھروں کا بھی نشان بتاؤ اور اُن کے مالکوں کے
 نام لو۔“ اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی اور ایک خاص
 مکان کے نام پر مریض کی نبض نے پھر رنگ بدلا۔
 اور شیخ نے اس بیان کرنے والے کو روک کر اس
 گھر کے رہنے والوں کے نام دریافت کئے۔ چنانچہ
 ایک لڑکی کا نام آتے ہی مریض کی نبض میں وہ

کیفیت پیدا ہو گئی جس کا شیخ کو خیال تھا۔ اور اس نے فی البدیہہ یہ دو شعر پڑھے :-
 دلبران نہ بولا خرد و بزرگ دیدہ رایوسف اندول راگرگ
 منگہ در بنان کہ آخر کار نگرستن رگرستن آرد بار
 پھر اس نے مریض کے عزیزوں کو بتایا کہ فلاں محلہ کے فلاں شخص کی لڑکی پر یہ جوان عاشق ہے۔
 اس کا علاج بجز دصال مجبوب کسی طرح نہیں ہو سکتا۔
 امیر قابوس کو یہ خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ وہ دانشمند حکیم حاضر دربار ہو۔ شیخ گیا۔ قابوس شیخ کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ فوراً پہچان گیا اور تخت سے اتر کر بنگلیہ ہوا۔ پھر اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑی عزت کے ساتھ اسے اپنے دربار میں رکھا۔ سلطان محمود کو تحائف گراں بہا بھیج کر اس سے شیخ کے لئے معافی طلب کی اور اس میں بھی وہ کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ شیخ کو خوف جان سے نجات ملی اور وہ باطمینان امیر قابوس کے پاس رہتا تھا۔ لیکن زمانہ ہمنوز موافق نہ تھا۔ امیر قابوس کی سپاہ باغی ہو گئی۔ اسے گرفتار کر کے قید اور قتل کر دیا۔ شیخ کا کوئی قدردان نہ رہا۔ ملک میں غدر و ہنگامہ تھا۔ علاج معالجہ کون کراتا اور طبیب کی قدر کس طرح ہوتی۔ آخر شیخ کو شہر چھوڑ کر دیہستان (دیہات) میں جانا پڑا اور وہاں ایک مدت تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہا۔ اسی حالت میں چند کتابیں لکھی

تجسّس کہ بیمار ہوا اور مجبوراً پھر جرجان میں آیا -
اس مرتبہ جرجان کا ایک خوشحال باشندہ ابو محمد شیرازی
معروف بہ عبد الواحد شیخ کا میزبان اور شاگرد بنا۔ اپنے
گھر کے پاس ایک مکان خرید کر شیخ کی نذر مہمیا اور
ہر طرح اس کی خدمت و خبر گیری میں مصروف ہوا۔
عبد الواحد کی رفاقت نے شیخ کو بھر راحت پہنچائی۔
وہ اس زمانہ میں اس کو درس دینے کے علاوہ کئی
کتابیں بھی تصنیف کرتا رہا۔ منطق میں المختصر الاوسط -
کتاب "المبداء و المعاد" اور "الارصاد الکلیہ" وغیرہ کے
علاوہ قانون کا ابتدائی حصہ - مجسطی کا خلاصہ اور چند
دیگر رسائل یہیں تالیف کئے اور باقی کتابیں درہستان
میں تمام کیں +

اگرچہ جرجان کے قیام میں شیخ کو کسی قسم کی
تکلیف یا شکایت نہ تھی لیکن سیاحت کا شوق دامنگیر
ہوا۔ اور وہ شہر سے کی طرف چلا۔ سے میں شیخ
کا کوئی واقف نہ تھا۔ مگر اس کامل اکمل کی شہرت
مشرقی دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی تھی۔ لہذا وہ
سابقہ معرفت اور دوستی کا محتاج کب تھا۔ شہر سے میں
پہنچتے ہی دھوم مچ گئی کہ "شیخ الرشید بوعلی سینا"
یہاں تشریف لائے ہیں۔ امیر و حکمران سے مجد الدولہ
کو اطلاع ہوئی تو اس نے شیخ کو دربار میں بلوا کر
بزمہ مصاحبین رکھ لیا۔ اور شیخ نے اس کے مرض
مالیخولیا کا علاج کیا۔ صحت کے بعد مجد الدولہ نے

خلعت و انعام و اکرام سے شیخ کو مالا مال بنا دیا اور دربار میں اس کا رتبہ سب مصاحبین و ارکان مملکت پر بڑھا دیا۔

شیخ کے میں آرام رہتا تھا۔ بیکایک افواہ اُڑی کہ سلطان محمود غزنوی اس شہر پر حملہ کرنے والا ہے۔ شیخ کو اگرچہ یہ معلوم تھا کہ امیر قابوس نے سلطان محمود سے اس کے لئے معافی کی سند حاصل کر لی ہے۔ لیکن بادشاہوں کے مزاج کا حال اس پر مخفی نہ تھا۔ اور اس واسطے وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا ناچار شہر کے کو چھوڑ کر قزوین چلا گیا۔ اور وہاں سے ہمدان جا پہنچا۔ جہاں کہ شمس الدولہ بن فخر الدولہ کی حکومت تھی۔ ہمدان میں شیخ نے پہلے ایک متول اور عالی مرتبہ رئیس ”کدبانو“ کی خدمت میں کچھ دن بسر کئے اور پھر شمس الدولہ کو درد قویح شروع ہونے پر علاج کی تقریب سے دربار میں پہنچ گیا۔ شیخ کے علاج سے شمس الدولہ کو بہت جلد صحت حاصل ہو گئی اور اس کا رتبہ دربار میں بڑھ گیا۔ خلعت و انعام بھی خوب ملا اور مصاحب خاص مقرر ہوا۔

منصب وزارت کا حصول :- شمس الدولہ نے کرمان پر فوج کشی کی۔ شیخ کو ساتھ لیا۔ اگرچہ اس حملہ میں ناکامی رہی لیکن اس سفر میں شمس الدولہ کو شیخ کے تدبیر اور انتظام ملک کی قابلیت کا حال معلوم

ہو گیا۔ اور کرمان سے واپسی پر اس نے شیخ کو
تکلیدان وزارت سپرد کر دیا۔ شیخ کو شاہی دربار میں
جتنا تقرب اور اعزاز حاصل ہوتا تھا استغریٰ ہی اس
کے دشمن اور اس پر حسد کرنے والے بڑھنے جاتے
تھے۔ مدت سے انتظام ملک کی خرابی نے شمس الدولہ
کا خزانہ حکومت خالی کر دیا تھا۔ فوج اور عمدہ داروں
کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شیخ ایک دم سے انتظام
نہیں کر سکتے تھا۔ راسخوں کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا
انہوں نے اپنے تبیطانی ارادوں کے پورا کرنے کا دستک
یہ نکالا کہ سپاہیوں میں مشہور کیا۔ کہ شیخ تمام روپیہ خود
ہضم کر جاتا ہے اور تمہاری تنخواہیں نہیں دلاتا۔ فوج
بگڑ کر شیخ کے گھر پر چڑھ دوڑی۔ اس کا سب
مال و متاع لوٹ لیا۔ اور اس کو پکڑ کے شمس الدولہ
کے پاس لے گئے کہ اس کو قتل کیا جاوے شمس الدولہ
فوج کو دبا نہ سکا۔ ناچار شیخ کی جان تو بچا دی لیکن
اس کے مال و اسباب کی واپسی کا انتظام نہ کیا اور
اسے رہا کر دیا۔

شیخ موت کے پنجہ سے پھوٹ کر شہر ہی میں
ایک دوست ابو سعید نامی کے مکان پر روپوش ہو گیا۔
چالیس دن وہ گوشہ نشین رہا۔ اس کے بعد شمس الدولہ
کو توبیخ کا سخت دورہ ہوا اور شیخ کی جستجو کی گئی
وہ پھر دربار میں آیا اور اپنے علاج سے شمس الدولہ
کو بہت جلد صحت سے ہمکنار بنایا یوں دوبارہ اس

کی آزادی بحال ہوئی - غلت : انعام بھی ملا - جو کچھ
اس کا نقصان ہوا تھا اس سے بدرجہا زائد مال پھر
ہاتھ لگا اور خلیفہ دین وزارت بھی مل گیا ۔
شمس الدولہ نے اس مرتبہ شیخ کا اعزاز خوب
بڑھا کر اس کے دشمنوں کو نظر سے گرا دیا - اور
انتظام ملک کا تمام سیاہ سفید اس کے ہاتھ میں
دے دیا - شیخ کاروبار وزارت کے ساتھ درس اور
تصنیف و تالیف سے بھی غافل نہیں رہتا تھا -
اس کا مخلص رفیق اور شاگرد رشید ابو عبد اللہ عبد الواح
برابر اس کے درس سے مستفید ہو رہا تھا - اس نے
شیخ سے درخواست کی کہ آپ ارسطو کی کتابوں پر
شرحیں لکھیں - لیکن شیخ نے معذرت کی اور کہا -
”مگر انتظام کا کام مجھ کو اتنی فرصت نہیں دیتا کہ
میں کتب کا مطالعہ کروں اور اس کام کو انجام
دوں جس کی تم خواہش کرتے ہو - مگر ہاں یہ ممکن
ہے کہ میں اپنی یادداشت اور خود اپنے دماغ کی
مدد سے ایک کتاب اس قسم کی لکھونگا - جس میں غیروں
کے اقوال اور مباحثات کا دخل نہ ہو - چنانچہ شیخ
نے اسی عظیم الفرستی کے زمانہ میں کتاب ”شفا“
تصنیف کی اور قانون کے پانچ حصوں میں سے بھی
ایک حصہ اسی حالت میں لکھا - شیخ دن کو وزارت کا
کام کرتا - اور رات کو درس اور ترمیم نیش و طرب
کے مشغلہ سے دل بہلاتا - شمس الدولہ کی وفات کے

ہو گیا۔ اور کرمان سے واپسی پر اس نے شیخ کو
تکدان وزارت سپرد کر دیا۔ شیخ کو شاہی دربار میں
بھٹنا تقرب اور اعزاز حاصل ہوتا تھا۔ اسی اس
کے دشمن اور اس پر حسد کرنے والے بڑھنے جاتے
تھے۔ مدت سے انتظام ملک کی خرابی نے شمس الدولہ
کا خزانہ حکومت خالی کر دیا تھا۔ فوج اور عمدہ داروں
کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شیخ ایک دم سے انتظام
نہیں کر سکا تھا۔ ماسدوں کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔
انہوں نے اپنے شیطانی ارادوں کے پورا کرنے کا ڈھنگ
یہ نکالا کہ سپاہیوں میں مشہور کیا۔ کہ شیخ تمام روپیہ خود
ہضم کر جاتا ہے اور تمہاری تنخواہیں نہیں دلاتا۔ فوج
بگڑ کر شیخ کے گھر پر چڑھ دوڑی۔ اس کا سب
مال و متاع لوٹ لیا۔ اور اس کو پکڑ کے شمس الدولہ
کے پاس لے گئے کہ اس کو قتل کیا جاوے۔ شمس الدولہ
فوج کو دبا نہ سکا۔ ناچار شیخ کی جان تو بچا دی لیکن
اس کے مال و اسباب کی واپسی کا انتظام نہ کیا اور
اسے رہا کر دیا۔

شیخ مورت کے پنجہ سے چھوٹ کر شہر ہی میں
ایک دوست ابو سعید نامی کے مکان پر روپوش ہو گیا۔
چالیس دن وہ گوشہ نشین رہا۔ اس کے بعد شمس الدولہ
کو توبہ کا سخت دورہ ہوا اور شیخ کی جستجو کی گئی
وہ پھر دربار میں آیا اور اپنے علاج سے شمس الدولہ
کو بہت جلد صحت سے ہمکنار بنایا یوں دوبارہ اس

کی آزادی بحال ہوئی۔ خلعت و انعام بھی ملا۔ جو کچھ
اس کا نقصان ہوا تھا اس سے بدرجہا زائد مال پھر
ہاتھ لگا کر اراکین و اہل وزارت بھی مل گیا۔
شمس الدولہ نے اس مرتبہ شیخ کا اعزاز خوب
بڑھا کر اس کے دشمنوں کو نظر سے گرا دیا۔ اور
انتظام ملک کا تمام سیاہ سفید اس کے ہاتھ میں
دے دیا۔ شیخ کاروبار وزارت کے ساتھ درس اور
تصنیف و تالیف سے بھی غافل نہیں رہتا تھا۔
اس کا مخلص رفیق اور شاگرد رشید ابو عبد اللہ عبدالواحد
برابر اس کے درس سے مستفید ہو رہا تھا۔ اس نے
شیخ سے درخواست کی کہ آپ ارسطو کی کتابوں پر
شرحیں لکھیں۔ لیکن شیخ نے معذرت کی اور کہا۔
”لیکن انتظام کا کام مجھ کو اتنی فرصت نہیں دیتا کہ
میں کتب کا مطالعہ کروں اور اس کام کو انجام
دوں جس کی تم خواہش کرتے ہو۔ مگر ہاں یہ ممکن
ہے کہ میں اپنی یادداشت اور خود اپنے دماغ کی
مدد سے ایک کتاب اس قسم کی لکھوں گا۔ جس میں غیروں
کے اقوال اور مباحثات کا دخل نہ ہو۔ چنانچہ شیخ
نے اسی عظیم الفرستی کے زمانہ میں کتاب ”شفا“
تصنیف کی اور قانون کے پانچ حصوں میں سے بھی
ایک حصہ اسی حالت میں لکھا۔ شیخ دن کو وزارت کا
کام کرتا۔ اور رات کو درس اور ہزم عیش و طرب
کے مشغلہ سے دل بہلاتا۔ شمس الدولہ کی وفات کے

بعد اس کا بیٹا شیخ کے خلاف ہو گیا اور اس کا منصب وزارت جاتے رہنے کے علاوہ اس کہ بعض دیرینہ دشمنوں کی چغل خوری کے باعث قید بھی ہونا پڑا + اس زندان خانہ میں شیخ کا رفیق و شاگرد ابو عبد اللہ بھی اس کے ہمراہ رہا اور محرک ہوا کہ فرصت غنیمت ہے۔ اس وقت اگر آپ کتاب ”شفا“ کو مکمل کر دیں تو بہت اچھا ہو۔ شیخ نے جواب دیا ”یہاں نہ تو میری کتابیں ہیں اور نہ سامان تصنیف اس لئے اگر تم اسی امر پر قناعت کر سکو کہ جو باتیں میرے ذہن و دماغ میں ہیں انہی کو لکھ ڈالوں تو بیشک یہ امر ممکن ہے“ ابو عبد اللہ اس عذر کو صحیح سمجھنے کے باوجود بھی جانتا تھا کہ شیخ کو کتابوں کے دیکھنے اور ان سے مدد لینے کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ جو باتیں اس بے نظیر وقت امام فن کے دماغ میں محفوظ ہیں ان کے سامنے کسی کتاب کی کوئی حقیقت نہیں چنانچہ اس نے اصرار کیا اور شیخ کو مجبور کر دیا۔ شیخ نے اسی قید کی حالت میں ”شفا“ کی کتاب الطبیعیات اور کتاب الحيوان دو حصے پچاس جز کے قریب اکیس دن میں لکھ کر تمام کر دئے۔ اور ”حی بن یقظان“ ”ہدایت الحکمت“ دو کتابیں اور بھی تصنیف کیں +

علی مونیہ ابو عبد اللہ کا یہ احسان کبھی نہ بھول سکیگی کہ محض اسی کی علی تشنگی اور شوق حکمت نے

دُنیا کو ایسی نادر کتابوں کی نعمت عطا کی۔ اور شیخ کے علم کا پایہ بھی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سیکھ سکن معارف و حکمت کا گنجینہ تھا۔ اور وہ کیسی بے مثل مہارت تصنیف و تالیف میں رکھتا تھا ؟

شیخ کو اس محبس میں ہنوز چار ماہ پڑے نہیں ہوئے تھے کہ اسی اشنا میں علاؤ الدولہ فرمانرواے اصفہان نے تاج الدولہ کی گوشالی اور ہمدان کو فتح کرنے کے ارادہ سے لشکر کشی کی۔ تاج الدولہ میں مقابلہ کی کتاب نہ تھی۔ اس نے یزدان کے قلعہ میں جہاں شیخ قید تھا پناہ لی۔ علاؤ الدولہ بآسانی تمام شہر ہمدان پر قابض ہو گیا۔ اس نے تاج الدولہ پر رحم کھا کر اُسے تاج بخشی کی اور خود اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ علاؤ الدولہ کی واپسی کے بعد شیخ سے اس کے دشمن تاج الملک نے اپنی خطا کی معافی چاہی اور کہا کہ تاج الدولہ کے ہرکاب ہمدان میں تشریف لے چلے۔ شیخ نے قبول کر لیا۔ اور پھر شہر میں آ کر ایک علوی سید کے گھر ٹھہرا۔ ملاقات اور صحبت ترک کر دی۔ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوا۔ علم طب کا مشہور رسالہ ”ادویہ قلبیہ“ وہیں لکھا۔ اور معتبر اقوال کے مطابق شمس الدولہ کی وفات کے بعد شیخ نے تقریباً دو سال کا زمانہ گوشہ نشینی اور تصنیف و تالیف ہی کے مشغلہ میں بسر کیا ؟

ہمدان میں رہنے سے دل بھر گیا تو شیخ کو اصفہان کی سیر کا شوق پیدا ہوا۔ علانیہ سفر کرنے میں تاج الدولہ کے مانع آنے اور زبردستی پکڑ رکھنے کا خوف تھا۔ اس واسطے درویشوں کا لباس پہنا اور مع ابو عبد اللہ کے جو اس کا رفیق جاں نثار اور شاگرد رشید تھا چند غلام اور مختصر سامان ساتھ لے کر چلا روپوشی کے عالم میں سفر کی دقتیں جھیلنا ہوا شیخ اصفہان کے قریب پہنچا اور شہر سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں اُترا۔ اس گاؤں کا نام ”طبرک“ تھا۔ علاؤ الدولہ کو اطلاع مل گئی کہ ”شیخ بوعلی بن سینا“ جس کے اشتیاق دید میں وہ مدتوں سے بیقرار تھا اس کے قلمرو میں آ گیا ہے۔ فوراً اسب خاصہ سواری کے لئے اور دزرا و امرا کو پیشوائی کی غرض سے بھیجا اور بعزت تمام شیخ کو طلب کر کے اپنے دربار میں جگہ دی۔ ہر جمعہ کی شب کو مجلس علمی آراستہ ہوتی۔ شیخ کسی نہ کسی حکمت کے مسئلہ پر تقریر کر کے اپنی نکتہ رسی اور فلسفی دیانت کا ثبوت دیا کرتا۔ انہی مجلسوں میں شیخ کی زباندانی میں خامی پر فن لغت کے امام ابی المنصور مجتہائی نے کوئی طعنہ دیا۔ شیخ اس وقت تو چُپ ہو رہا لیکن گھر آتے ہی فن لغت کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور تین سال کی محنت میں ایک ایسی نادر کتاب لغت میں لکھی جس کی دس

جلد میں تھیں۔ یہ کتاب ”لسان العرب“ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ شیخ اس کے مسودہ کو صاف نہ کر سکا تھا کہ پیام اجل آ پہنچا۔ اور جب اس نے زبانزدانی کا تھک کر لیا تو تین قصیدے بہت فصیح و بلیغ لکھ کر مخفی طور سے بادشاہ کو نذر کئے۔ اور ابی المنصور سے ان کے مطالب دریافت کرئے گا ایما کیا۔ چنانچہ ایک مجلس میں علاؤ الدولہ نے وہ قصائد ابی المنصور کو دئے اور کہا کہ ان کے مطالب حل کرو یہ آج ہی مجھ کو ملے ہیں۔ ابی المنصور نے قصائد پڑھے تو بہت سے مقامات اس کی سمجھ میں بھی نہ آ سکے۔ شیخ نے دیکھا کہ ابی المنصور خاموش ہے تو اس نے وہ مشکل اشعار خود حل کر دئے اور اس خوبی سے مطالب کی تشریح کی کہ تمام علمائے دربار متحیر رہ گئے۔ ابی المنصور سمجھ گیا کہ ہونہ ہو یہ قصائد شیخ ہی کی تصنیف ہیں اور اس نے مجھ کو میرے طعن کا یوں جواب دیا ہے۔ لہذا وہ ناوم ہو کر شیخ سے معذرت کرنے لگا۔ اور اس کی ذہانت و طباعی کا لوہا مان گیا۔ علاؤ الدولہ نے بھی شیخ پر زور ڈالا کہ وہ منصب وزارت قبول کرے۔ اگرچہ شیخ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے مقابلہ میں سلطنت اور انتظام ملک میں مصروف ہونے کو نا پسند کرتا تھا۔ لیکن تعمیل حکم میں چار و ناچار کار وزارت قبول کر لیا۔

اور اس لیاقت سے خدمات وزارت ادا کیں جو اسی کا حصہ تھا۔ پھر لطف یہ کہ دن کو وزارت کا کام کرتا اور صبح کو مشغلہ درس و تدریس جاری رکھتا۔ ابو عبد اللہ - کیا بیس - بہمن یار - ابو منصور فیہ - عبد الواحد جرجانی اور سلیمان دمشقی شیخ کے جلیل القدر شاگرد تھے۔ ہمیشہ اس کی مجلس درس میں علم حکمت کی باریکیاں سننے اور تحقیق کی داد دیتے تھے۔ ایک رات ان یاران مکتبی نے سامان و لپچی سے حظ اٹھانے اور سو و لعب میں بسر کی تھی - علی الصباح معمول کے موافق شیخ کی مجلس درس میں گئے تو وہاں جتنے مسائل پر شیخ نے تقریر کی ایک بھی ان کی سمجھ میں نہ آئے - استاد شفیق ان کے بشرہ سے تازہ گیا کہ ان لوگوں نے کچھ سمجھا نہیں ہے۔ آہ سرد بھر کر ان سے کہا - ”میں نے سنا ہے کہ رات تم لوگ وقت عزیز کو ضائع کرتے رہے تھے“ سب شاگردوں نے ندامت کے ساتھ اپنے قصور کو مان لیا۔ اور شیخ نے انہیں نصیحت کی کہ حصول کمال کے شوق کو ایسے مشاغل سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تم کیسے شایق علم ہو کہ عمر گرانا یہ راگیاں کھوتے ہو۔ طلبہ پر شیخ کی مربیانہ نصیحت کا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے آئندہ کے لئے ایسی خطا سے توبہ کی کہ شیخ کو طبی معالجات سے بھی غاص شوق تھا۔ اور وہ اگر ادھر متوجہ نہ بھی ہوتا تو قدردان اور

حاجت مند اسے کب چھوڑتے تھے۔ بیشمار عجیب و غریب اور ہرمرکے کے علاج اُس کے ہاتھ سے ہموئے اور خلق اللہ کو شیخ کی ذات سے بیحد نفع پہنچتا رہا۔ شیخ طبی معالجات میں کسی کا پیرو نہ تھا۔ بلکہ خود مجتہد اور نئے نئے اصول کا بانی اور موجد تھا۔ وہ بہت کم کتابی نسخوں یا مرکب دواؤں سے کام لیا کرتا۔ خود نئے نسخے تجویز کرتا اور امراض کے متعلق ایسی تحقیق پر مائل رہتا کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی نئی معلومات کا انکشاف کرے یا کسی جدید علامت کا حال دریافت کرے *

ایک دولتمند و معزز آدمی ”مالیخولیا“ میں مبتلا ہوا۔ اسے یہ وسواس ہو گیا کہ وہ ”گائے“ بن گیا ہے۔ ویسی ہی بولی بولتا اور لوگوں سے کہتا ”میں خوب فرہ گائے ہوں مجھ کو ذبح کر کے میرا گوشت جلد پکاؤ“ مرض دن بدن ترقی کرتا گیا۔ کھانا پینا ترک ہوا۔ کمزوری سے اُٹھ سکتا مشکل ہو گیا۔ اور جان پر آہنی۔ تمام طبیب علاج کر تھکے۔ صحت نہ ہوئی۔ آخر شیخ کی طرف رجوع لائے۔ اور علاؤ الدور نے خود شیخ سے سفارش کی کہ اس مریض کا علاج کیجئے۔ شیخ نے پہلے مریض کے عزیزوں اور خادموں سے مفصل حالات سُن لئے پھر ان سے کہا ”مریض سے جا کر کہ دو کہ قصاب کو اطلاع کر دی گئی ہے وہ جلد آکر تم کو ذبح کریگا۔“ مریض یہ مژدہ سُنتے ہی خوش

ہو گیا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے ہی میں شیخ بھی بہت شان و شوکت کے ساتھ مریض کے یہاں جا پہنچا۔ اور پھڑکی اٹھ میں لے کر بندہ آواز سے کہا: وہ گائے کہاں ہے جو فوج کی جانیگی؟ اس کو باہر لاؤ؟ شیخ کے استفسار کا جواب خود مریض نے گائے کی بولی میں دیا اور اپنا مقام بتایا۔ شیخ اس کے قریب گیا۔ اپنے ملازم کو حکم دیا کہ اس گائے کے اٹھ پیر باندھ دو۔ پھر اس کے سینے پر بیٹھ کر قصاب کی طرح خوب اس کا جسم ٹٹولا اور کہا: ”یہ گائے تو بیحد لاغر ہے۔ فوج کرنے کے لائق نہیں۔ اس کو خوب کھلا رکھ کر فربہ کرنا لازم ہے کہ جلد تیار ہو جائے۔“ یہ کہہ کر شیخ تو چلا گیا۔ اور گائے یعنی مریض کو غذا دی جانے لگی۔ وہ بھی اس اشتیاق میں کہ اب فوج ہونے کا وقت آ گیا ہے خوب کھانا پیتا۔ غذا میں مناسب دوائیں شریک ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ بیمار کی کمزوری بھی جاتی رہی اور مزاج بھی اصلاح پر آ گیا۔ علاؤ الدولہ نے شیخ کے حسن تدبیر پر آفرین کہی اور اس کو خلعت و انعام سے سرفراز بنایا۔

اسی وزارت کے زمانے میں شیخ نے متعدد کتابیں بھی تالیف و تصنیف کی تھیں۔ کتاب شفا کو مکمل کیا۔ منطق۔ مجسطی۔ افلکس۔ ارثماطیقی (ارتھمیک) اور موسیقی کے مسائل جو پہلے باختصار

لکھے تھے ان میں اضافہ کیا۔ اور ایک تازہ کتاب
 ”نجات“ نامی لکھی۔ شیخ کی وسعت نظر اور خدا زاد
 ذہانت سے علم تقادیم میں بھی فائدہ اٹھانا ضروری
 تھا۔ علاؤ الدولہ نے اس کو رصد خانہ بنانے کا حکم
 دیا۔ اور خزانہ شاہی سے اس کے مصارف ادا کرنے
 کی اجازت دے دی۔ سامان شروع ہوا۔ آلات وغیرہ
 سامان ضروری جمع ہوا اور جس قدر اس زمانے میں
 مل سکتا تھا وہ سب فراہم کر لیا گیا۔ شیخ نے تعمیر
 رصد خانہ کا اہتمام اپنے خاص شاگرد ابو عبد اللہ کے
 سپرد کیا تھا جس نے اس کام میں پوری کوشش کی۔
 اور شیخ نے ایک رسالہ رصد اور رصد گاہ کے متعلق
 تمام ضروری مسائل اور لوازمات و طریق عمل پر حاوی
 تصنیف کر کے ابو عبد اللہ کے حوالہ کیا تھا۔ اسی
 کی ہدایتوں پر عمل کر کے ابو عبد اللہ سامان و آلات
 وغیرہ فراہم کرتا رہا۔ لیکن شیخ کی عظیم الفرستی اور
 علاؤ الدولہ کے بکثرت سفر میں رہنے کے باعث یہ
 قابل قدر کام ناتمام رہ گیا۔ عمارت رصد گاہ کی مکمل
 نہ ہو سکی۔ اور اس کام میں اتھ ڈالنے کا صرف یہ
 نتیجہ نکل کر رہ گیا کہ علم نجوم و فلکیات کے متعلق
 بعض پیچیدہ مسائل حل ہو گئے *
 اسی زمانہ میں شیخ نے اپنے مخدوم علاؤ الدولہ
 کے نام پر ایک کتاب فن حکمت میں تصنیف کی
 اور اس کا نام ”علائیہ“ رکھا۔ شیخ کی مستغنی طبیعت

مال و جاہ و دنیاوی کی کچھ پروا نہیں رکھتی تھی -
ایک مرتبہ علاؤ الدولہ نے اس کو اپنا خاص مرصع
پٹنگہ اور منجھڑ انعام میں دیا - یہ اتنا معزز تحفہ تھا
کہ اور کسی کو ملتا تو وہ فخر کے ساتھ اسے استعمال
کرتا اور موجب عزت سمجھتا - لیکن شیخ نے یہ تحفہ
اپنے ایک غلام کو بخش دیا - اور علاؤ الدولہ نے
اتفاق سے وہ چیزیں غلام کے پاس دیکھ کر جب
یہ معلوم کیا کہ شیخ نے اس کے بے نظیر عطیہ کی
ایسی بے قدری کی ہے وہ سخت برہم ہوا اور
شیخ کے قتل کی فکر میں پڑ گیا - اگرچہ شیخ کا
ایک زمانہ قدردان تھا اور سلاطین وقت اس کے
اپنے دربار میں رہنے کو باعث فخر مانتے تھے -
لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جو بادشاہ یا امیر
اس سے ناخوش ہوا وہ اس کی جان ہی کا خواہاں
بنا - شیخ کو تو اس قسم کے حادثات پیش ہی
آتے رہتے تھے - وہ ان باتوں کی پروا بھی نہ
کرتا تھا - اس کے خاص دوستوں نے اطلاع دی
کہ علاؤ الدولہ آپ کی جان کا لاگو ہو رہا ہے -
شیخ چند ہمراہیوں کو لے کر اسی وقت اصفہان
سے شہرِ رے کی طرف چل دیا +
شیخ رے کے بازار میں جا رہا تھا - ایک جوان
طبیب کے پاس مریضوں کا ہجوم دیکھ کر رُک گیا -
جوان طبیب لوگوں کے قارورے اور ان کی نبض

دیکھ کر دوا تجویز کرتا جاتا تھا۔ ایک عورت کی باری آئی اور اس نے قارورہ دکھایا تو جوان طبیب نے اس سے کہا ”یہ قارورہ یہودی کا ہے اور وہ نشیبی جگہ میں رہتا ہے“ عورت نے اس کی تصدیق کی۔ اور شیخ کو جوان طبیب کی فراست پر تعجب ہوا۔ اتنے ہی میں جوان کی نظر شیخ پر بھی جا پڑی۔ اس نے شیخ کو صلا کر اپنے سے بلند مقام میں بٹھالیا۔ اور جب مطب سے فارغ ہو چکا تو شیخ سے کہا ”آپ شیخ الرئیس بوعلی سینا ہیں۔ اور علاؤ الدولہ کے خوف سے اصفہان چھوڑ کر یہاں چلے آئے ہیں“ اب شیخ کی حیرت حد سے بڑھ گئی اور وہ اس نوجوان کو غیب داں سمجھنے پر آمادہ ہو گیا ہوتا اگر اسے یہ نہ معلوم ہوتا کہ جوان طبیب کو خداوند کریم نے قیافہ دانی اور نکتہ رسی کا بہت بڑا حصہ عطا کیا ہے۔ بہر حال اس جوان طبیب نے شیخ کو اپنا مہمان رکھا اور نہایت عزت و تکریم سے اس کی خدمت کرتا رہا۔

ابھی شیخ کو رے میں آئے چند دن سے زیادہ نہ گزرے ہونگے کہ علاؤ الدولہ کو ایسے فاضل بے نظیر کے ہاتھ سے کھو دینے پر ندامت ہوئی اور اس نے معذرت نامہ لکھ کر شیخ کی طلب میں تادم دوڑائے۔ شیخ کی طبیعت میں غرور اور کینہ مطلق نہ تھا۔ وہ طلبی کا اشارہ ملتے ہی بلا تاویل

اصفہان چلا گیا اور اپنے جوان میزبان کو بھی ساتھ لے گیا۔ جسے علاؤ الدولہ کی مصاحبت میں جگہ دلوائی اور اس کی عزت بڑھائی۔

شیخ نے علاؤ الدولہ کی خدمت بیچر دلسوزی سے کی۔ اس کو کئی مرتبہ مہلک مرض کے حملہ میں اپنی بے مثل تدابیر سے محفوظ رکھا۔ سلطان مسعود نے اور خراسان کے تاجدار نے علاؤ الدولہ پر حملہ کیا۔ علاؤ الدولہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلا۔ اور مسعود اس کی ۶۰ ہزار گز فاصلہ کر کے لے گیا۔ شیخ چونکہ علاؤ الدولہ کا ٹھکانہ خوار ہو چکا تھا۔ اس کو گوارا نہ ہوا کہ سلطان مسعود اس کے آقاے نفست کی بہن کو ذلیل کرے۔ لہذا اس نے ایک موثر تحریر سلطان مسعود کو لکھی۔ اور علاؤ الدولہ کی بہن کے اوصاف کی بیحد تعریف کر کے سلطان کو ترغیب دلائی کہ وہ اس خاتون سے عقد کر لے اور اسے اپنی حرم خاص بنائے۔ یوں علاؤ الدولہ بھی اس کا زیر بار منت و احسان ہو کر مطیع بن جائیگا۔ سلطان مسعود نے شیخ کی اس ہدایت پر عمل کیا۔ اور علاؤ الدولہ ایک بڑی بے حرمتی سے بیچ رہا۔ دوسری مرتبہ جب سلطان مسعود نے کسی بات پر ناراض ہو کر علاؤ الدولہ کو لکھا کہ وہ اس کی بہن کو طلاق دے کر سخت ذلیل و خوار کریگا۔ تو شیخ ہی نے پھر ایک مناسب خط کے ذریعے سلطان

کو ایسی قبیح کارروائی سے باز رکھا اور علاؤ الدولہ کی طرف سے اس کا دل صاف کر دیا۔
 وفات :- شیخ اپنا علاج خود ہی کیا کرتا تھا۔ اس کو درد قولنج کی شکایت تھی۔ قبض دور کرنے کے لئے حقنہ لیا کرتا۔ علاؤ الدولہ نے ایک غنیم پر چڑھائی کی اور شیخ اس کے ساتھ تھا۔ درد کا دورہ ہوا۔ شیخ نے جلد تر مرض سے نجات پانے کے واسطے ایک دن میں آٹھ مرتبہ حقنہ کیا۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبض تو جاتا رہا۔ لیکن آنتوں میں کچھ خراش آگئی اور ایک تکلیف سے پھوٹ کر دوسری مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ بڑی مشکل یہ آئی کہ اسی دن علاؤ الدولہ نے دوسرے مقام کا ارادہ کیا اور شیخ کو سفر کرنا ضروری ہو گیا۔ ایسی حالت میں حرکت سخت خطرناک تھی۔ مگر مجبور تھا۔ روانہ ہوا۔ مقام مقصود پر پہنچا تو مرگ اور تشنج کے آثار اس پر عیاں ہوئے۔ کبھی کبھی قولنج کے بعد یہ حالت مریض پر طاری ہوا کرتی ہے۔ اور بھی متعدد امراض پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے طبیعت کو سخت کمزور بنا دیا اور اب یہ حالت ہو گئی کہ شیخ کو زندگی سے باہوسی ہو چلی۔ علاج میں ایک سخت بے احتیاطی یہ ہوئی کہ اس نے قبض توڑنے اور کسر ریاح کی غرض سے دو دانگ تخم کرفس اپنے نسخہ میں رکھا تھا۔ مگر جو طبیب اس کے واسطے دوا بناتا تھا اس نے پانچ درم

تخم کرفس نسخہ میں ڈال دیا۔ خواہ اس نے جان بوجھ کر
ایسا کیا۔ یا بھول کر۔ لیکن شیخ کو اس دوا کے پینے
سے کمال افیت ہوئی۔ آنتوں کی خراش اس کی گرمی
سے بڑھ گئی۔ مرگی کو دُور کرنے کے واسطے وہ
مشردیطوس کا استعمال کرتا تھا۔ بد دیانت غلاموں نے
جو شیخ کی بہت کچھ دولت چُرا کر اب اس خوف
سے کانپ رہے تھے کہ وہ حساب دیکھیگا تو ہماری
شامت آئینگی اس کی جان لینے کا ارادہ کیا اور بہت
سی افیون دوا میں ملا دی۔ یہ دوا پیتے ہی شیخ
کا حال متغیر ہو گیا۔ جس حرکت کے قابل نہ رہا۔
اور اسی حالت سے وہ اصفہان لایا گیا۔ اب شیخ کے
جسم میں قوت بالکل نہ تھی۔ اس نے علاج ترک کر
دیا اور خدا پر شاکر ہو بیٹھا۔ بد پرہیز اعلیٰ درجہ کا
تھا۔ شروع سے اپنی بے احتیاطیوں ہی کے ذریعے
بیماری بڑھائی اور جب قوت زائل ہو گئی تو تدبیر سے
کیا ہو سکتا تھا۔ زندگی کے باقی دن اسی تکلیف سے
کاٹے اور آخر کار ۳۸ھ میں ۵۳ سال عمر پا کر
دنیا سے چل بسا۔

شیخ کی وفات کے بعد اُسے شہر ہمدان کے پانچم
جانب دیوار فصیل کے نیچے دفن کیا گیا۔ اور ایک قول
یہ ہے کہ نہیں اُس کی لاش اصفہان میں لائی گئی۔
اور خاص اس کے مکان سکونت ”کون گنبد“ کے دروازہ
پر دفن کی گئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ مرض قویج

کا حکمی علاج کیا کرتا تھا۔ لیکن خود اسی مرض میں فوت ہوا، اور کوئی دوا کارگر نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کے کسی ہمعصر نے اس امر کے متعلق کہا ہے :-

لَا يَتَّيْتُ ابْنَ سَيْنَا يُعَادِي الرِّجَالَ
ابن سینا جو لوگوں سے مخالفت کیا کرتا تھا میں نے اُس کو دیکھا کہ

وَبِالْجُبْنِ مَاتَ اخْتِ الْمَمَاتِ

وہ قبض سے بُری طرح مر گیا
فَلَمْ يَشْفَ مَا نَالَهُ بِالشِّفَاءِ
نہ اُس کو ”شفا“ (لے کتاب کا نام جو شیخ کی تصنیف ہے) سے بچھ حاصل ہوا۔

وَلَمْ يَنْجُ مِنْ مَوْتِهِ بِالنَّجَاتِ
اور نہ وہ ”نجات“ (لے شیخ کی ایک کتاب کا نام) کے ذریعے اپنی موت سے بچ سکا۔

شیخ کا مذہب :- کیا تھا؟ اس بارہ میں سخت اختلاف ہے۔ بعض اس کو اہل سنت و الجماعت بتاتے ہیں۔ تو چند شیعہ قرار دیتے ہیں۔ اور اکثر نے اس پر کفر کا الزام لگایا ہے۔ لیکن شیخ نے کفر و بد دینی کے طعنوں کا جواب اپنی ایک رباعی میں دیا ہے جو حسب ذیل ہے :-

رباعی

كُفْرٌ جَوْ مَنَ كَرَامٍ وَ آسَاں نَبُو
در دہریکے چو من و آں ہم کافر پس در ہمہ دہریک مسلمان نہ بود

اس رباعی میں شیخ اپنے کفر کی تردید اور لطیف
پیرایہ میں اسلام کا اقرار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس
کے عقائد کا حال ایک خط کے پڑھنے سے واضح
ہو جاتا ہے جو اس نے اپنے ایک زاہد و عابد
دوست ابو سعید کو لکھا تھا شیخ اس خط میں لکھتا ہے:-
”خوب یاد رکھو کہ نماز بہترین عمل ہے اور روزہ
بہت اچھا سکون۔ صدقہ تمام نیکیوں سے بڑھ کر مفید
نیکی ہے۔ اور پاکیزہ ترین خوبی تحمل و بردباری ہے۔“
ہم کو چونکہ مذہب سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں
اس واسطے صرف اس قدر لکھنا کافی تصور کیا گیا۔
ہاں یہ ضرور ہے کہ فیلسوف و حکیم کبھی اس اوہام
پرستی کے پھندے میں نہیں رہ سکتا جو عام اہل ادیان
کا خاصہ ہے۔ اس لئے آزاد خیالی اس کا شیوہ ہوتا
ہے۔ اور قدامت پسند یا لکیر کے فقیر پیروان مذاہب
اس طح کے علما و حکما پر بد دینی کا الزام لگاتے
ہی رہتے ہیں۔

شیخ کے کارناموں کی قدردانی :- شیخ نے علی
دنیا میں جو کچھ کام کیا اس کا اچھا یا بُرا ہونا اسی امر
سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آج علم و فن کی ترقی کے
بے مثل زمانے میں یورپ کی علم دوست قومیں بھی اس
کی جتنی تصانیف سے پورا پورا فائدہ حاصل کر رہی ہیں۔
گو یہ افسوس ہے کہ اس فخر ایشیا حکیم و طبیب کی
قدر و منزلت خود اس کے ملک والوں نے بہت کم

کی۔ لیکن کمال اپنے قدردان ضرور پیدا کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے یورپ اس کی تحقیقات پر دلدادہ ہوا اور ہے۔ جرمنی کے جٹی مارس میں شیخ کی کتابوں کے ترجمے پڑھائے جلتے ہیں۔ اور اکثر یورپ کے نامور طبیب اس کی آراء کو مسلم مانتے ہیں۔ شیخ کی وہ تصانیف جن کا آج ایشیا میں نام و نشان تک نہیں رہتا یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں اور وہاں کے بڑے بڑے حکما اور علما مسلمان فیلسوفوں میں سے فارابی۔ بوعلی سینا۔ اور ابن رشد کے علمی کارناموں کا سچے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔



ابن حزم

نام و نسب :- علی نام۔ ابو محمد کنیت۔ باپ کا نام احمد تھا۔ سلسلہ نسب ”علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح بن خلف بن معدان بن سفیان“ ہے۔ سفیان یزید بن ابی سفیان اموی کے مولے تھے اور دراصل وہ ملک فارس کے رہنے والے تھے۔ پہلے وہی مشرف باسلام ہوئے۔ اندلس میں ابن حزم کا پڑدادا حزم آیا اور یہیں رہ پڑا تھا۔ ابن حزم کا باپ احمد بن سعید نہایت مدبر وزیر تھا اور صاحب املاک و جاگیر۔ ابن حزم

کو آبائی میراث میں اچھی جائداد ملی تھی اور وہ امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا +

ولادت تعلیم و تربیت :- ماہ رمضان ۳۸۷ھ کی آخری تاریخ مبدھ کے دن شہر قرطبہ کے مشرقی محلہ میں پیدا ہوا۔ اور ایک وزیر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے بڑی راحت و آرام کے ساتھ پلا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ زبان۔ انشا پر داری۔ فقہ۔ حدیث۔ اور تفسیر کے علوم میں اچھا ماہر ہونے کے بعد منطق و فلسفہ کی تعلیم قرطبہ کے نامور عالم محمد بن حسن ندجی سے پائی جو ”ابن الکنانی“ کے لقب سے مشہور اور بڑا فاضل شخص تھا +

ابن حزم نہایت ذہین۔ طباع۔ اور سمجھدار شخص تھا۔ یادداشت اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو بات سنتا یا جو کتاب ایک بار دیکھ لیتا وہ فوراً یاد ہو جاتی۔ زباندار اور شاعر بھی تھا۔ فی البدیہہ نظم لکھنے میں کمال رکھتا تھا۔ پہلے اور علموں سے شوق رہا اور اخیر میں علم حدیث کے ساتھ زیادہ دلچسپی ہو گئی اور اسی علم میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ مسلمان علمائے اندلس میں ابن حزم کو سب سے بڑھکر علوم کا جامع مانا گیا ہے۔ یہ طبیب بھی تھا۔ کئی رسالے طب میں لکھے تھے۔ کتاب ”الفصل فی الملل و الاہواء و النحل“ یعنی مذاہب عالم کی بے مثل تاریخ اسی کی تصنیف ہے +

ابن حزم اور ابوالولید سلیمان الباجی کے مابین بہت سے مناظرے اور جھگڑے ہوئے تھے جن کا بیان موجب طوالت ہوگا۔ وہ اگلے زمانے کے علما پر بہت سنہ آیا کرتا تھا۔ کم ہی کوئی اس کی زبان سے بچا ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ لوگ اس کے مخالف ہو گئے اور اسے بُرا بھلا کہتے تھے۔ اس کے اقوال رد کر کے اس کو عمرہ اور بے دین قرار دیا اور ہمعصر عالموں نے بادشاہان وقت سے کہا کہ ابن حزم مفید ہے اس کے فتنے سے ڈرتے رہو۔ عوام کو بھڑکا کر ابن حزم سے ملنے کی مانگت کی۔ اسی وجہ سے بادشاہوں نے ابن حزم کو اپنے دربار میں نہ آنے دیا بلکہ اسے اپنے ملکوں سے بھی نکال دیا۔ اور ابن حزم اسی آوارہ گردی اور خانہ بدوشی کی حالت میں پھرتا پھرتا صحراے کبکۃ میں چلا گیا +

ایک مورخ کا قول ہے کہ ابن حزم کی زبان اور ظالم حجاج بن یوسف کی تلوار دونوں میں براہی کی نسبت تھی۔ اس قول کی وجہ یہ ہے کہ ابن حزم نے فقہ کے اماموں پر بڑی سخت چوٹیں کی ہیں۔ خصوصاً اپنی کتاب ”الفصل فی الملل والنحل“ میں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے اس نے اہل سنت و الجماعت پر بڑے زبردست حملے کئے ہیں +

ابن حزم اس جلا وطنی کی حالت میں اپنے جاگیر کے گاؤں ”مَنْتَ لیشم“ میں اکثر رہا کرتا۔ یہ قریہ

”بلکہ“ کے علاقہ میں واقع ہے +
 تصانیف :- علاوہ اُن کتابوں کے جن کا ذکر اوپر
 آچکا ہے - ابن حزم نے اور بھی بکثرت کتابیں اچھی
 اچھی لکھی تھیں - ابن حزم کا بیٹا ”ابو رافع الفضل“
 بیان کرتا ہے کہ اس کے پاس خاص اس کے باپ
 کے قلم سے لکھی ہوئی چار سو جلد کتابیں ہیں - جن
 میں تقریباً اسی ہزار ورق ہونگے +

ایک کتاب ”اظہار تبدیل یہود و نصاریٰ للتوراة
 والا انجیل“ لکھی ہے - اس میں ظاہر کیا ہے کہ یہود
 و نصاریٰ نے اپنی آسمانی کتابوں میں کیا رد و بدل
 کیا ہے اور جو کتاب آج ان کے پاس موجود ہے
 اُس میں کیا تناقض پایا جاتا ہے اور نطفہ یہ ہے کہ
 اس کی کچھ تاویل بھی نہیں بن پڑتی - اس بحث پر
 سب سے پہلے ابن حزم ہی نے کتاب لکھی ہے +
 فقہ حدیث میں ”ایصال“ نامی ایک جامع کتاب
 لکھی ہے اس میں صحابہ اور اُن کے بعد آنے والے
 مسلمان اماموں کے فقہی اقوال نقل کر کے ان پر
 جو اعتراضات اور جوابات ہو سکتے تھے ان کو بھی
 درج کرتا گیا ہے +

منطق میں کتاب ”التقریب“ اس کی عجیب انداز
 کی تصنیف ہے - بیان کا طرز بجد و دلنشین ہے +
 ابن حزم کے حکمت آمیز اقوال بھی بکثرت اور
 نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں - وہ اپنے گھاؤں

”مَنْت لیشم“ میں بماء شعبان ۳۵۴ھ فوت ہوا اس کا بیٹا ابو رافع الفضل نہایت فاضل شخص اور ”مقصد بن عباد“ حاکم ایشیلیہ کا مصاحب خاص تھا۔ اور اسی کے ساتھ جنگ ”زلاقہ“ میں مقتول ہوا۔ اور ابن حزم کا باپ شان بن عامر کا وزیر رہا تھا۔ وہ بڑا صاحب تدبیر اور اعلیٰ درجے کا ذی علم شخص تھا +



ناصر خسرو

نام و نسب :- حکیم ابو العین ناصر بن خسرو علوی - ملک خراسان کا قدیم شاعر - اور شاعری کے علاوہ علوم حکمیہ اور فلسفہ میں بے مثل فاضل تھا - امام علی بن موسیٰ الرضاؑ اس کے آٹھویں جد اور مورث اعلیٰ ہیں - امام ممدوح کے وقت سے ناصر کے باپ دادا خراسان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے - اور مستقل اقامت اختیار کر لی تھی - حضرت امام رضاؑ کا مزار شہر ”طوس“ علاقہ خراسان میں ہے جو اس زمانہ میں ”مشہد“ کہلاتا ہے - مورخین نے اس کے حالات بہت ہی کم لکھے ہیں اور جو لکھے ہیں وہ زیادہ تر ناقابل اعتبار - اگر ہم مورخین کی اس فروگزاشت کو کہ وہ اس کے حالات

لکھنے سے عاری رہے اس کے علم و فضل کی قدر
 نہ کرنے کے نام سے موسوم کریں تو غالباً اس میں
 کوئی بیجا شیت نہ ہوگی۔ وہ تو اس کے سفرنامہ اور
 دیوان کے کچھ حصہ کا وجود اس کی لیاقت کا مخبر بنا
 ورنہ معاصر علما اور تذکرہ نویسوں نے تو اس فاضل
 و حکیم کا نام ہی مٹا دیا تھا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ
 ایک ہی زمانہ کے آدمیوں میں باہمی رقابت اور
 ناچاقی ہونا ایک طبعی اور قدرتی امر ہے لیکن ایسی
 بھی مخالفت کس کام کی جو کسی جوہر قابل کی قدر نہ
 کرنے دے۔ ہر وقت اور زمانہ کے علما اور مؤرخین
 ایک دوسرے کے علم و فضل کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔
 ان کی معاصرت نے اگر کوئی باہمی اختلاف رائے پیدا
 کیا ہے تو ایک نے دوسرے پر نکتہ چینی بھی کی
 ہے۔ اس نکتہ چینی سے بعد میں آنے والے مؤرخین
 کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ ان لوگوں کی نسبت جن
 پر عیب لگائے گئے ہیں مفصل حالات سے واقف
 ہوں اور ان کے اخلاق و عادات پر صمیم رائے قائم
 کر سکیں۔ لیکن ناصر خسرو کے ہمعصر شاید اسے ”اسغلیہ“
 فرقے کا پیرو سمجھ کر اس سے اتنی نفرت کرتے رہے
 کہ اس کا کوئی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہ کیا۔
 اگرچہ ہمعصروں نے ناصر خسرو کے ساتھ اچھا سلوک
 نہ کیا تھا لیکن اس کی قابلیت کہ رہی تھی کہ ”اے
 ناقدر دانو! ٹھیر جاؤ! تم کو اپنی اس فروگزاشت پر

بہت جلد پشیمان ہونا پڑیگا۔ اور میرا جوہر اب نہیں
 تو میرے بعد تم سے یہ منوالیگا کہ تم نے جس
 شخص کو بُرا سمجھا وہ دراصل بُرا نہ تھا، بہر حال
 جب ناصر خسرو کا دیوان اشعار اور اس کی دوسری
 تصانیف کی ملک میں اشاعت ہوئی تو لوگوں نے
 اس کی قدر جانی۔ انہوں نے دیکھا کہ ناصر خسرو کا
 مزار کوہستان بدخشان میں عام و خاص کی زیارت گاہ
 بنا ہے۔ اب موریخین کو اس کے حالات لکھنے کا
 خیال ہوا۔ انہوں نے صحیح و غلط جو کچھ سنا وہی قلبہ
 کر دیا۔ ان حالات میں زیادہ تر ناصر کو ملنے والوں
 کی عقل اور قیاس سے دور روایتیں ہیں۔ ان میں سے
 سچی باتوں کا انتخاب سخت کٹھن کام ہے۔ ہاں
 فرانس کے ایک نامور ”مستشرق“ ”چارلس شیفر“ نے اس
 حکیم کی ایک سوانح عمری اپنی زبان میں لکھی ہے اور
 اس نے بڑی کنج کاوی کے ساتھ صحیح قیاسات قائم کرنے
 کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ
 وہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اور
 اسے کتنی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہم ذیل میں کچھ
 موریخین ایشیائی کی تصانیف سے اور کسی قدر خود
 ناصر خسرو کے سفرنامہ اور کلام سے اس کے حالات
 کا استنباط کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ یہ
 سوانح بہت کچھ صحیح اور حقیقت سے قریب ہونگے۔
 لہ وہ یورپین عالم جو مشرقی علوم کے محقق ہوں +

ولادت - تربیت اور تعلیم :- ناصر خسرو کی تاریخ ولادت میں سخت اختلاف ہے۔ معتبر قول یہ ہے کہ وہ ۵۹۷ھ میں بمقام شہر بلخ پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ۷

”بگزشت ز ہجرت پس سیصد نود و چار“

بہناد مرا مادر بر مرکز غمنا ۸
اور یوں اپنی تاریخ ولادت بتاتا ہے۔ پھر ایک اور شعر میں شہر بلخ کو اپنا وطن اور جائے ولادت اس طرح ظاہر کر رہا ہے ۷

”اے بادِ عصر گر گزری بر دیار بلخ“

بگزر بخائے من و آنجا بجوے حال“

خاندان سیادت کا نور نظر ہونے کی وجہ سے ابتدائی تعلیم جیسی ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ سب سے پہلے کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کا حافظ بنا۔ ۹ سال کی عمر میں اس سے فارغ ہو کر۔ پھر مروجہ علوم ادب۔ منطق۔ دینیات۔ ریاضیات اور نجوم و رمل میں کئی سال تک مشغول درس رہا اور فاضل یگانہ بن گیا۔ اسلامی علوم کے علاوہ اگلے ادیان اور ان کے آسمانی صحیفوں کا بھی بہت زبردست عالم تھا۔ یہودی اور عیسائی مذاہب کے علما اپنے مشکل دینی مشلوں میں اس سے فتوے لیا کرتے تھے۔ ناصر خسرو کے سفرنامہ سے پتا ملتا ہے کہ وہ عبری زبان کے لکھنے اور پڑھنے میں بخوبی قادر تھا۔ کیونکہ فلسطین

کے سفر میں اس نے عبرانی زبان کے قدیم کتبوں کو حل کیا ہے +

علمی اور عملی زندگی :- تحصیل علم و کمال کے بعد ناصر خسرو نے کچھ عرصہ تک درس بھی دیا۔ اور پھر علمی تحقیقات کا شوق دامگیر حال ہونے پر سیاحت اختیار کی۔ پہلا سفر اپنے وطن شہر بلخ سے ”مروشاہماں“ کی طرف کیا۔ یہ شہر خراسان کا ایک مرکزی مقام اور سلجوقی خاندان کے بادشاہوں کا پایہ تخت رہا ہے۔ اس کی خاک سے اکثر نامی گرامی علما و فضلا پیدا ہوئے ہیں۔ ناصر خسرو یہاں پہنچا اور اس کے علم و لیاقت کا آوازہ ”امیر چغزبگ سلجوقی“ نے سنا تو اس کو اپنی مجلس میں بلوایا اور مال کے دفتر کا افسر بنا دیا +

۳۳۵ھ یعنی ۴۲ سال کی عمر ہونے تک امیر چغز کے دربار میں عزت و نیکنامی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اپنا کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ اور دنیاوی جاہ و عزت کا خوب لطف حاصل کیا۔ مگر اخیر میں سلطنت کی خدمات سے دل اُچھاٹ ہو گیا۔ اور حج و زیارت سیر و سیاحت کے شوق نے دل میں گدگدی پیدا کی۔ نوکری اور جاہ و حشم سے کنارہ کیا۔

۳۳۵ھ چغزبگ - سلطان ملک شاہ سلجوقی کا چھوٹا بھائی اور اس کی طرف سے شہر مروشاہماں پر حاکم مقرر تھا۔ سلطان ملک شاہ کا پایہ تخت شہر ”نیشاپور“ تھا + مؤلف

سفر پر کمر باندھی۔ چھوٹا بھائی ”ابوسعید“ اور ایک غلام رفیق ہوا۔ یہ زبردستی ساتھ ہو لئے تھے۔ اور یوں مرو شاہجہاں سے چل نکلا +

سیاحت :- ناصر خسرو خراسان کے شہروں۔ عراق کی بستیوں۔ آرمینیا کے مقاموں اور شام و فلسطین کی آبادیوں میں گھومتا پھرتا ٹھیک حج کے ایام میں مکہ مکرمہ پہنچا۔ ارکان حج ادا کئے۔ روضہ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوا اور پھر مصر کو چلا گیا۔ مصر کا قیام کچھ ایسا پسند آیا کہ بقول بعض سات برس۔ اور معتبر قول کے لحاظ سے تین سال وہاں بسر کئے۔ اس عرصہ میں دو مرتبہ اور بھی حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ مصر میں اس کے پہنچنے کا زمانہ ”خلیفہ مستنصر باللہ علوی فاطمی عبیدی“ کا عہد تھا۔ ناصر خسرو کی ایک درباری امیر سے دوستی ہو گئی۔ اس کے وسیلہ سے قصر خلافت اور قلعہ قاہرہ کی سیر نصیب ہوئی۔ یہ تو پتا نہیں چلتا کہ

۱۔ اس خاندان حکومت کا بانی عبید اللہ المہدی عالی نسب والا حسب سید آل رسول صلعم تھا اس نے مہدویت کا دعوے کیا اور پہلے افریقیہ میں اور پھر مصر میں زبردست حکومت قائم کی۔ یہ خاندان مصر میں خلافت کا مدعی اور بنی عباس خلفائے بغداد کا حریف تھا۔ مستنصر باللہ علوی اس خاندان میں نہایت ذی سطوت حکمران ہوا ہے۔ اس نے اپنی دعوت کو بیحد فروغ دیا اور مصر کے علاوہ بنی عباس کے کئی ممالک پر متصرف ہو گیا تھا + مؤلف

آیا دربار میں بھی اس کی رسائی اور خلیفہ مستنصر باللہ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ ناصر کو خلیفہ کی زیارت حاصل نہ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس نے اپنے سفرنامہ میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ایسا اہم واقعہ بلا ذکر چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ مگر ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ناصر خسرو نے عمداً خلیفہ مستنصر باللہ سے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا ہو اس لئے کہ اس زمانہ میں ملک عباسیہ کی رعایا مصری خلفا سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔ اور ایسا کرنے والا مجرم متصور ہوتا تھا۔ بلکہ عراق کے سفر کا حال لکھتے ہوئے ناصر خسرو نے اپنے ہر جگہ جانے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کربلائے معلیٰ۔ نجف اشرف۔ اور کاکلین میں گزر کرنے کا نام ہی نہیں لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان شبرک شاہ کی زیارت بھی سیاسی جرم رہی ہوگی۔ ورنہ ایک آزاد منش سیاح یہاں کیوں نہ جاتا۔ اور کس لئے ان کے ذکر سے پہلو بچاتا +

انقلاب عقائد :- ناصر خسرو فیلسوف عالم تھا۔ وہ اندھی تقلید پر کبھی عامل نہیں رہا۔ لیکن خاندان سیادت کا نور نظر۔ صاحب علم و ہنر اور عالی گوہر ہونے کی وجہ سے ابتدا میں اس کی طبیعت دینداری کی طرف ضرور مائل تھی۔ یہ تو صاف طور سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس عقیدہ کا پابند تھا۔ مگر شیعہ امامیہ

بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ سفرنامہ میں اس کے جاہجا ایسے جملے نظر سے گزرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اثنا عشری مذہب سے بے تعلق تھا۔ اور اجنبی۔ بہر حال پہلے کیسا ہی اور کچھ عقیدہ کیوں نہ رکھتا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ قیام مصر کے بعد جب وہ اپنے وطن میں واپس آیا۔ تو خلیفہ مستنصر باللہ کی محبت دل میں لایا۔ اور علویہ اور اسماعیلیہ دعوت کی منادی کرنے لگا۔

اس دعوے کو لوگوں سے منوانے کے لئے ناصر خسرو نے ہم عصر علما سے مناظرہ کرنا شروع کیا۔ اسی مناسبت سے اپنا تخلص حجت قرار دیا۔ اصفہان اور رستم دار کے علما بحث میں اس سے ہارے تو اس

اسماعیلیہ فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند اکبر امام اسماعیل ۲ امام ہفتم تھے۔ ان کے نزدیک اماموں کی تعداد بارہ نہیں بلکہ سات ہونی چاہئے۔ ہاں ہر امام کے ۱۲ نقیب ہونے ضرور ہیں۔ اسی طرح امامت کے متعدد سلسلے سات سات اماموں پر تمام ہوا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس فرقہ کے عقیدہ میں امام اسماعیل ساتویں امام تھے۔ مگر وہ ان کے فرزند امام محمد کو سابع تام یعنی امامت کے درجہ ہفتم کو مکمل کرنے والا مانتے ہیں۔ پھر ان کے بعد تین امام باطن مانتے ہیں جو دنیا میں دعوئے امامت کے ساتھ نمودار نہیں ہوئے۔ اور چوتھے امام عبید اللہ المہدی نے مغرب میں اس دعوت کو ظاہر کیا۔ یہی مہدی مصری خلفائے فاطمیین کے خاندان کا بانی اور مورث اعلیٰ ہے۔ یہ مذہب شرع کو فلسفہ کا تابع مانتا اور اسی وجہ سے فیلسوف دماغوں کے حسب مذاق ثابت ہوتا ہے۔

پر کفر و الحاد کا الزام لگا کے قتل کے درپے ہوئے۔ ناصر وہاں سے بھاگ کر خراسان کی طرف چلا۔ راستہ میں شیخ ابو الحسن خرقانیؒ سے سرآمد مشائخ سے ملاقات ہوئی۔ اور شیخ نے اس کو اپنی روشن ضمیری کا قائل بنا دیا۔ یہ قصہ اگرچہ وثوق کے قابل نہیں تاہم دلچسپی کے لحاظ سے بالاختصار ہم اس کو ذیل میں درج کئے دیتے ہیں :-

شیخ ابو الحسن خرقانیؒ حکیم ناصر کی آمد سے ایک دن پہلے اپنے خادموں سے کہہ چکے تھے کہ کل یہاں ایک جعتی آئیگا۔ اُسے ان کے روبرو لانا اور خاطر و مدارات سے کام لینا۔ ناصر شیخ کی خانقاہ میں پہنچا۔ مرید اور خادم اُسے شیخ کے حضور میں لے گئے۔ شیخ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ حکیم نے عرض کیا۔ ”شیخ بزرگوار! میری آرزو ہے کہ اب قیل و قال چھوڑ کر باقی عمر اہل حال کی پناہ میں بسر کروں“۔

شیخ (تبسم فرما کر) ”تم اور میری صحبت پسند کرو!! یہ غیر ممکن ہے۔ تمہیں مدت ہوئی کہ ناقص عقل کے پیرو بنے ہو۔ اور میں پہلے ہی دن اس مردار کو اپنے پاس سے دُور کر چکا ہوں“۔

لے بڑے صاحب مرتبہ ولی اللہ اور حضرت سلطان الہند خواجہ اجبیر کے پیر تھے + مؤلف

حکیم - کیا خوب! رسول خدا صلعم کی حدیث میں
 "تو آیا ہے کہ - اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ" اور آپ
 اس کو ناقص بتاتے ہیں !!!

شیخ - "نادان! وہ انبیاء کی عقل ہے۔۔۔ مجھے
 اس کوچہ کی ہوا تک نہیں لگی۔ تم اور بوعلی سینا
 ناقص عقل کے پیرو ہو اور اس پر مغرور۔ میری
 بات کا یقین نہ آئے تو یہ سُنو! تم نے کل راستہ
 ہی میں ایک قصیدہ کہا ہے اس میں عقل کو
 ایجادِ عالم کا باعث قرار دیا ہے۔ اور گوہر کن نکان
 مانا ہے۔ مگر تم غلطی پر ہو "گوہر کن نکان" سے
 "مطلع عشق" مراد ہے۔ تمہارے قصیدے کا
 مطلع یہ ہے

"بالائے ہفت طاق مقرنس دو گوہر اند

کز کائنات و ہرچہ دروہست برتر اند"

حکیم شیخ کی روشن ضمیری دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔
 وہ کئی دن خدمت میں حاضر رہا۔ اور پھر وہاں
 سے خراسان کی طرف روانہ ہوا۔

ناصر پہلے نیشاپور گیا۔ وہاں اس کی نسبت افواہ
 اڑ گئی کہ سحر اور تنخیر کا علم جانتا ہے۔ اس کے
 مناظرہ کی قوت علمائے نیشاپور کو معلوم ہو چکی
 تھی انہوں نے اس افواہ کو سچی خبر بنا دیا۔ اور

لے سب سے پہلے خدا تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے +

خدا نے حکم دیا کہ ہو جائے تمام کائنات موجود ہو گئی +

ناصر کے قتل کا فتوے لگا دیا۔ امیر ابو سہل صعلوکؒ
میشاپور کے قاضی القضاۃ نے ناصر کو سمجھایا کہ
”تم ایک فاضل آدمی ہو۔ تمہارا کلام نہایت بلیغ
ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ علما سے بحث کرنا
چھوڑ دو۔ وہ تم سے بند ہو کر تمہارے دشمن
ہو جاتے ہیں۔ اور اب بہتر یہ ہے کہ اس شہر
سے کہیں دوسری جگہ چلے جاؤ۔“

ناصر یہ رائے مان گیا اور شہر بلخ کی جانب
روانہ ہوا۔ بلخ اگرچہ اس کا اصلی وطن اور جائے
ولادت و تربیت تھی۔ لیکن اپنے عقیدہ کی اشاعت
کرنے پر یہاں بھی سب آدمی اس کے دشمن بن
گئے۔ اور اسے اتنا ستایا کہ اس کو روپوش ہو کر
رہنا پڑا۔ چنانچہ وہ اہل وطن کی شکایت اور اپنی
بے گناہی کے متعلق چند اشعار میں اپنا خیال یوں
ظاہر کرتا ہے ۷

”بنالم بتو اے قدیم و قدیر نہ اہل خراساں صغیر و کبیر
چہ کردم کہ ازمن رسیدہ شدند ہمی خویش و بیگانہ بر خیر خیر“
اور پھر اپنے اعتقاد کو اس طرح بیان کرتا ہے ۸
”مقرّم بفران پیغمبرت نہ انبارم گفتم ترا نے نظیر
بامت رسانید پیغام تو محمد رسولت بشیر و نذیر ۹

۷ یہ خراسان کا باشندہ اور بڑا نامور عالم۔ اور علما کا قدردان
تھا۔ مولف ۸ تمام قاضیوں کا اعلیٰ افسر۔ چیف جسٹس۔ ۹ ۱۰ شریک
۱۱ خوشخبری اور دھڑکا دینے والے ۱۲

نیاورد قرآن بہ پیغمبرت مگر جبرئیل آں مبارک سفیر
مُقرّم برگ و بحشو و صاحب کتابت زبّر دارم اندر ضمیر
لیکن اہل خراسان نے اس کو بہت بد نام اور سوا
کیا تو وہ بلخ سے بھی بھاگ کر بدخشان کے پہاڑی
علاقہ کے اندر ایک درہ میں جس کا نام ”میکان“
تھا پناہ گزین ہوا۔ اور پھر اخیر دم تک وہیں رہا۔
اسی مقام میں رہنے کے سبب اس کو ”میکی“ بھی
کہا جاتا ہے۔ یہیں اس نے ایک قصیدہ اہل بلخ
کی مذمت میں لکھا ہے۔ اور اپنے دل کی خوب بھڑاس
نکالی ہے۔ ناصر ورہ میکان میں کئی سال رہا۔ اور
یہیں اُس نے ۵۸۱ھ میں ۴۷ برس کی عمر پا کر
دنیا سے رحلت کی +

پہاڑی باشندے اس کے بچہ متقدّم ہو گئے تھے۔
اس کا عقیدہ ان میں خوب پھیلا تھا۔ مگر وہ اس کو
ولی اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ جانتے تھے۔ چنانچہ
بہت سے خرافات قصے ناصر کی کرامت اور خلافت
عادت باتوں کے ان میں مشہور ہیں۔ اور وہی
حالات بعد کے مؤرخین نے اس کے تذکرہ میں
درج کر دیئے ہیں۔ کوئی اس کو سحر و نیرونگ کا
عامل مانتا تھا۔ کسی نے پیروں اور دیوؤں کو اس
کے تابع سمجھ رکھا تھا۔ بعض خدا رسیدہ بزرگ مانتے

لہذا ایچی + لہذا یعنی قیامت اور جزا و سزائے اعمال کا
فائل ہوں + لہذا حفظ۔ یاد +

تھے۔ مگر ان فضولیات سے ناصر کو کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ اخیر وقت میں درویشی اور معرفت الہی کا شیدا بن گیا ہو۔ کیونکہ شیخ فرید الدین عطار ج اپنی مثنوی میں ناصر کی نسبت کہتے ہیں کہ ”وہ زمرہ واصلین میں داخل پایا جاتا ہے“

ناصر خسرو کا مذہب :- کیا تھا؟ یہ بڑی پیچیدہ گنتی ہے جو کسی طرح حل نہیں ہوتی۔ اس کی نظم کے چند اشعار جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر ایک سچے عقیدے کا مسلمان تھا۔ مگر اس کی حسب ذیل نظم ثابت کرتی ہے کہ ماویٰ اور دہری رہا ہوگا۔ کہتا ہے :- نظم -
مرد کے را بدشت گرگ درید زو بخوردند سرگش و زاغان
ایں یکے ریڈ بر سبر کسار واں دگر رید در بن چاغان
ایں چنین کس بچشر زندہ شود تیز در ریش مردک ناداں
اس قطعہ میں ناصر جسم کے حشر و نشر کا صاف انکار کر رہا ہے۔ اور اس کے جواب میں محقق طوسی نے

لہ گدہ۔ عہ کوتہ۔ عہ بیٹ کی۔ عہ کٹوٹے۔ عہ غالباً وزیر نظام الملک محقق طوسی ہوگا جو ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم اور ناصر خسرو کا معاصر تھا۔ مگر مورخین اس کو محقق کے لقب سے یاد نہیں کرتے بلکہ وزیر نظام الملک طوسی ہی لکھتے ہیں۔ محقق طوسی خواجہ نصیر الدین کا لقب ہے جو ہلاکو خان کا وزیر تھا اور ناصر خسرو سے تقریباً دس سو سال بعد ہوا ہے + مولف

ناصر خسرو پر چوٹ کی ہے :- نظم
 ”ایں چنیں کس بخش زندہ شود گر نایند عنصرش جو جو
 ز اولیں بار نیست مشکل تر تیز در ریش ناصیر خسرو“
 پھر ناصر خسرو اپنے اشعار و قصائد میں ام المومنین
 حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت ابو بکرؓ حضرت عمر فاروقؓ
 حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی تعریف بھی کرتا ہے۔
 اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلمان
 فیلسوف تھا۔ کسی مجتہد امام کے طریقے کا پابند۔
 یا مذہب اثنا عشریہ کا پکا معتقد نہ تھا۔ رہی یہ
 بات کہ وہ تنازع کا قائل اور دہریت کی جانب
 مائل تھا۔ اس کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ مصر
 کے خلیفہ مستنصر باللہ کی محبت نے اس کو عباسی
 خلفا کی طرف سے برگشتہ اور مذہب اسمعیلیہ کا طرفدار
 بنا دیا ہوگا اور اس مذہب کے عقائد پر یہ تمام
 الزامات ٹھیک اُترتے ہیں۔ اس کے سوا وہ تفضیلی
 بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ عقیدہ اکثر مسلمانوں کا رہا
 ہے اور اس پر کچھ بہت زیادہ گرفت نہیں ہو
 سکتی۔ فرقہ اسمعیلیہ کے عقائد اس کے بعض اشعار
 سے بھی مترشح ہوتے ہیں *
 یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا نام بدنام کرنے
 والوں نے ایسے اشعار خود کہ کر ناصر کے کلام میں
 داخل کر دیئے ہوں۔ اس واسطے کہ ناصر کا عقیدہ

لے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اور صحابہ پر افضل ماننے والا +

تا دمِ مرگ اسلام کے صحیح اعتقادات کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اور وہ معاہدہ - رسالت اور توحید کا اقرار رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس کی ایک نظم مندرجہ سابق سے واضح ہو رہا ہے +

البتہ ناصر خسرو کا بیٹا "خواجہ معین الدین" بلا کسی پردہ داری اور تقیہ کے مذہب امامیہ اشنا عشریہ کا معتقد اور ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں ملازم تھا + تصانیف :- ناصر خسرو کے دماغی کارنامے یعنی اس کی تصانیف میں ایک دیوان اشعار ۳۰ ہزار ابیات کا اس کی یادگار ہے۔ اور اس کے علاوہ نظم میں کتاب "روشنائی نامہ" نشر میں کتاب "کنز الحقائق" اور کئی دیگر کتب بھی موجود ہیں۔ خصوصاً اس کا سفرنامہ - عبارت کی سادگی - واقعات کی تحقیق - اور مبالغہ سے نفرت کرنے کا ایک بے مثل نمونہ اور بڑی مستند تصنیف ہے۔ ناصر خسرو نے اس میں کوئی ایسی بات درج نہیں کی ہے جو عقل میں نہ آسکے اور معمول کے خلاف ہو۔ اگر کہیں کوئی اس قسم کی روایت ضرورت یا مجبوری سے لکھنی ہی پڑی ہے تو اس کی صحت یا غلطی کا ذمہ وار اصل راوی کو قرار دیا اور اپنا دامن بلا تحقیق کچھ لکھ جانے کی آلودگی سے بچا لیا ہے +

لے قیامت - مرنے کے بعد دوبارہ زندگی جس میں دنیاوی زندگی کے اعمال و افعال کا جواب دہ ہونا پڑیگا +

اہل یورپ نے آج بیسویں صدی میں اپنے سفرناموں کے اندر جو خوبیاں پیدا کی ہیں اُن سے بدرجہا زائد عمدگیاں حکیم ناصر خسرو کے اس قدیم سفرنامہ میں موجود ہیں۔ اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جہاں گردانِ یورپ اپنے حالاتِ سفر کے مدون کرنے میں ان مسلمان سیاحوں کی تقلید سے انکار نہیں کر سکتے۔



امام غزالی

نام و نسب :- محمد نام - اور غزالی کے نام سے مشہور تھے - ان کا لقب ”حجتہ الاسلام“ ہے - باپ کا نام بھی محمد تھا اور دادا کا بھی محمد - پردادا کا نام احمد ہے ۔

ملک خراسان کا ایک ضلع ہے ”طوس“ اس میں طابران اور تورقان دو شہر ہیں - امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ میں بمقام طابران پیدا ہوئے - آپ کے والد سوت کی تجارت کیا کرتے تھے - اور عربی زبان میں ”غزل“ کے معنی سوت کا تنہا اور سوت - دونو ہیں - اسی لئے ان کا گھرانہ ”غزالی“ کہلاتا تھا - یہ نسبت ملکی زبان کے قواعد کے مطابق ہے - عربی و فارسی قواعد زبان سے اس کو کچھ تعلق نہیں ۔

بعض نے لکھا ہے کہ ”غزالہ“ طوس کے ضلع میں ایک گھاؤں تھا اور آپ اس کی طرف نسبت کئے جاتے ہیں۔ اس قول کو صحیح مانا جائے تو ”غزالی“ میں تشدید ”زا“ نہ پڑھینگے۔ بلکہ ”زے“ کو تخفیف کے ساتھ بولینگے۔ مگر یہ قول معتبر نہیں۔ ٹھیک وہی ہے جو پہلے لکھا گیا ۛ

ابتدائی تعلیم :- امام صاحب کے باپ بے پڑھے لکھے تھے۔ جب ان کا وقت آخر ہوا تو انہوں نے اپنے ایک دوست کو وصیت کی کہ ”میں تو علم سے محروم رہا۔ لیکن یہ دو لڑکے محمد اور احمد (امام صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی کے نام ہیں) چھوڑنا ہوں۔ آرزو یہ ہے کہ ان کو تعلیم دلائی جائے۔“ چنانچہ ان کی وفات کے بعد اس دوست نے امام صاحب اور ان کے بھائی کو تعلیم دلانا شروع کر دیا۔ جو سرمایہ ان کا باپ چھوڑ گیا تھا وہ خرچ ہو چکا تو امام صاحب کے سرپرست نے ان سے کہا۔ ”تمہارے باپ جو مال چھوڑ گئے تھے وہ سب میں نے تم دونوں بھائیوں پر خرچ کر دیا ہے۔ میں خود کوئی مالدار آدمی نہیں ہوں۔ مجھ سے تمہاری پرورش اور تعلیم کا خرچ نہ بن پڑیگا۔ اس واسطے بہتر ہوگا کہ تم کسی مدرسہ میں داخل ہو جاؤ۔“ ان دنوں ہر شہر اور بستی میں مدرسے موجود تھے۔ بلکہ شہروں میں کئی کئی مدرسے ہوتے۔ ہر ایک عالم کسی

مسجد میں یا اپنے مکان پر درس دیا کرتا۔ امام غزالی اور ان کا بھائی دونو ایک مدرسہ ہیں داخل ہو گئے۔ طالب علموں کے لئے اس زمانہ میں مدد کا یہی دستور تھا جو آجکل ہمارے ملک میں عربی اور اسلامی مدرسوں کے طلباء کے لئے مقرر ہے ہر جگہ کے خوش حال اور مخیر اشخاص ایک ایک دو دو طالب علموں کی مدد کرتے تھے +

امام غزالی نے علم فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے ہی شہر کے ایک بزرگ عالم احمد بن محمد راذکانی سے پڑھیں۔ پھر شہر جرجان میں جا کر امام ابو نصر اسمعیل سے علم حاصل کیا۔ ان دونوں قاعدہ یہ تھا کہ استاد کسی علمی مسئلے پر تقریر کرتا اور طالب علم اس کی یادداشتیں لکھ لیا کرتے۔ امام صاحب نے بھی اپنی یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ جرجان سے گھر واپس آنے لگے تو راستہ میں ٹھیروں نے سب سامان لوٹ لیا اور وہ یادداشت کے مسودے بھی رہزموں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ مگر امام صاحب کو یادداشت کے ضائع ہونے کا بڑا رنج تھا ان کو صبر نہ آیا۔ چوروں کے سردار سے ملنے گئے اور کہا "مال و سامان سے کچھ غرض نہیں وہ تم رہنے دو۔ مگر میری یادداشت تو دے دو۔ تم اس سے کوئی فائدہ نہیں پا سکتے۔ ڈاکوؤں کا سردار یہ بات سن کر ہنس پڑا اور اس نے کہا "تم نے

اتنے دن پڑھا اور کیا خاک سیکھا۔ ایک کاغذ نہ رہا۔
تو اب تمہیں گویا کچھ نہیں آتا ہے اور یہ کہ اگر اس
نے کاغذات ان کو دے دئے۔ امام غزالی کے دل
پر ڈاکو سردار کے طعنہ کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ
گھر آتے ہی انہوں نے وہ لکھی ہوئی یادداشتیں
زبانی یاد کرنی شروع کر دیں۔ اور تین سال میں وہ
سب یاد کر ڈالیں +

اعلیٰ تعلیم کا شوق :- یادداشت کے حفظ
کر لینے سے علمی مسائل دماغ اور سینہ میں بھر گئے
تو معمولی عالموں سے پڑھنے میں ان کا دل نہ لگا
اور کسی اچھے استاد اور زبردست عالم کی تلاش ہوئی۔
آپ کے وطن سے شہر نیشاپور نزدیک تھا اور
اس زمانہ میں وہاں امام الحارثی جیسے بے مثل عالم
موجود تھے +

امام الحارثی کے علم اور کمال کی ڈھاک تمام ملک
میں بندھی تھی۔ امام غزالی نے ان کی شاگردی کر کے
تمام علوم پڑھے اور امام الحارثی کے حلقہ درس میں
چار سو طلباء کے اندر ان کو خاص امتیاز حاصل ہوا۔
بزرگ استاد خود اپنی زبان سے ان کو ”دریائے ذخائر“
کہا کرتے تھے۔ اور اخیر میں تو انہوں نے علم و فضل
میں وہ درجہ پایا جو استاد کو بھی نصیب نہ ہوا تھا +
اگرچہ امام غزالی اپنے استاد امام الحارثی کے سامنے
ہی نام پانچکے تھے اور انہوں نے کتابیں بھی تصنیف

کر لی تھیں۔ لیکن استاد کی زندگی تک ان کی خدمت سے الگ نہ ہوئے۔ جب امام الحرمین کا مسئلہ میں انتقال ہو گیا۔ تو امام غزالی ۲۸ برس کی عمر میں نیشاپور سے نکلے اور اس شان سے بھلے کہ اسلامی دنیا میں آپ ہی اپنی مثال تھے +
 دربار رسی :- علم و کمال پیدا کر چکنے کے بعد اب وہ وقت آ گیا تھا کہ امام غزالی اس کا پھل کھائیں اور عزت و دولت کے مرتبہ پر پہنچیں۔ مگر یہ بات شاہی دربار کے سوا کہاں حاصل ہو سکتی تھی اس زمانہ میں ترکی قوم کا خاندان سلجوقی اسلامی دنیا میں سب سے بڑا حکمران گھرانہ تھا۔ بغداد کی خلافت گویا ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور امیر نظام الملک طوسی اسی خاندان کے نامور بادشاہ ملک شاہ بن الب ارسلان کا وزیر تھا وزیر نظام الملک بڑا علم دوست اور منتظم تھا۔ اس نے اپنے وسیع ملک میں ہر جگہ بڑے چھوٹے مدرسے قائم کر رکھے تھے اور شاہی خزانہ سے ۱۰ کروڑ روپیہ کی رقم تعلیم میں خرچ کرنے کے علاوہ اپنی گرہ سے بھی اس کام پر بہت کچھ صرف کرتا رہتا تھا بغداد میں اس کا بنایا ہوا ”مدرسہ نظامیہ“ اس وقت دنیا سے اسلام میں سب سے بڑا دارالعلم تھا۔ امام غزالی نے نیشاپور سے نکل کر بغداد ہی کا صیخ کیا۔ نظام الملک ان کی شہرت سن مچکا تھا۔ اس نے بڑے تپاک

سے ہاتھوں ماتھ امام صاحب کو لیا اور اپنے
 سایہ میں جگہ دی۔ پھر ان کے علم و کمال کا
 ثبوت پا کر ان کو مسئلہ میں مدرسہ نظامیہ کا
 مدرس اول بنا دیا۔ امام غزالی کی عمر اس وقت
 ۳۸ سال کی تھی۔ اور ان سے پہلے کوئی مدرس
 مدرسہ نظامیہ میں اتنا کم عمر نہیں مقرر ہوا تھا۔
 اس منصب پر پہنچ کر امام غزالی کو دولت
 و حشمت۔ عزت و مرتبہ سب کچھ مل گیا۔ ان
 کا اعزاز ایسا بڑھا کہ بڑے بڑے امیر اور وزیر
 سب ان سے دب کر رہنے لگے۔ کئی دفعہ ایسا
 اتفاق ہوا کہ خاندان سلجوقی کے تاجدار اور عباسی
 خلیفہ بغداد کے مابین بعض جھگڑے آ پڑے اور
 امام غزالی ہی نے اپنے اثر سے وہ جھگڑے بڑی
 عمدگی کے ساتھ طے کر دئے۔ اور کسی امیر یا وزیر
 سے اس وقت کوئی کام نہ نکلا۔ حکومت اور شاہی
 دربار سے تعلق کی یہ حالت تھی۔ اور علمی رتبہ ایسا
 تھا کہ تین سو بڑے بڑے مدرس اور سو امیر و
 رئیس آپ کے حلقہ درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔
 آپ کے وعظ بھی ایک طرح کے علمی لکچر ہوتے۔ اور
 شیخ صاعد بن الفارس المعروف بہ ابن اللبان نے ان
 کو لکھ کر امام غزالی سے نظر ثانی بھی کرائی تھی۔
 یہ سب وعظ بغداد میں ۱۸۳ ہیں اور ان کا مجموعہ
 دو ضخیم جلدوں میں ”مجالس غزالیہ“ کے نام سے

مشہور ہے *

ترک دُنیا :- امام غزالی کی طبیعت میں تحقیقات کا شوق قدرتی تھا۔ جب وہ بغداد میں آئے تو وہاں ہر فرقہ اور مذہب کے لوگوں سے ملے مختلف مذاہب کے عقائد کی ٹٹول کی اور سب کو ظاہری خول پایا۔ اخیر میں اہل تصوف کا حال جانچنا شروع کیا۔ مگر یہ فن علمی نہ تھا بلکہ علمی تھا اس واسطے ضرورت معلوم ہوئی کہ نفس کشی - ریاضت - اور مجاہدہ کریں۔ شوق تو یہ چاہتا تھا کہ دُنیا کے جھگڑے چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں اکیلے رہے اور یادِ خدا کیجئے۔ اور دُنیا کے تعلقات دامن پکڑتے تھے کہ یہ عیش و آرام اور عزت و نام چھوڑ کے کہاں جاتا ہے۔ اس کشمکش میں طبیعت پریشان رہنے لگی۔ اور تندرستی خراب ہو گئی۔ حکیموں اور طبیبوں نے مرض لا علاج سمجھا اور دوا کرنا بے فائدہ بتایا۔ پھر تو امام غزالی سب باتیں ترک کر کے سفر پر آمادہ ہو گئے۔ معتقدین - امرا - وزیر - علما اور شاگردوں نے بہت روکا۔ مگر امام صاحب نہ رُکے اور بغداد سے دمشق چلے گئے ”جامع امویہ“ کی مشہور مسجد میں چلے گئے اور ریاضت شروع کر دی۔ اس حالت میں درس بھی دیا کرتے لیکن زیادہ وقت مراقبہ اور یادِ الہی میں گزارتے *

دو برس دمشق میں رہ کر ”بیت المقدس“ گئے

اور اس کی زیارت کر کے شہر خلیل پہنچے جہاں حضرت
 ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی قبر ہے۔ اور ہر جگہ
 چلے گیا۔ اس کے بعد حج اور زیارتِ قبر نبوی صلم
 کے لئے تشریف لے گئے۔ مدت تک مکہ مکرمہ میں
 مقیم رہے اور اسی سفر میں مصر اور اسکندریہ کی
 بھی سیر کی۔ اسکندریہ میں کچھ زمانے تک قیام فرمایا۔
 اور ارادہ کیا تھا کہ یوسف بن تاشفین سے ملنے
 مراکش جائیں لیکن اس کے انتقال کی خبر سن کر یہ
 ارادہ توڑ دیا۔ اس سفر میں اکثر خرچہ (گڈری) پہنے
 اور پانی کی چھاگل بدل میں دباٹے جنگلوں اور پہاڑوں
 کی سیر کیا کرتے تھے۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام
 کی قبر پر حاضر ہو کر تین باتوں کا عہد کیا تھا۔
 (۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جائینگے۔ (۲) کسی
 بادشاہ کا عطیہ نہ لینگے۔ اور (۳) کسی سے مناظرہ
 اور مباحثہ نہ کریں گے۔ مرتے دم تک ان باتوں کی
 پابندی رکھی۔ اور دس سال اس سفر میں بسر کئے۔
 کہا جاتا ہے کہ امام غزالی نے اپنی مشہور کتاب
 ”احیاء علوم الدین“ اسی سفر میں لکھی۔ کیونکہ گو زیادہ
 تر اس دس سال کے عرصے میں آپ پر جذب
 غالب رہتا تھا لیکن کبھی کبھی سلوک کی حالت میں
 بھی رہتے اور اُس وقت درس اور تصنیف کا شغل
 کیا کرتے تھے۔

حج سے فارغ ہو کر گھر اور بال بچوں کی یاد وطن

لے گئی۔ وہاں بھی گوشہ نشینی ہی اختیار کی۔ لیکن روزی کی فکر چین سے نہ بیٹھنے دیتی اور اطمینان کا وقت کم ہاتھ آتا۔

دوبارہ مدرسہ کرنا۔ مجاہدہ اور ریاضت نے

قلب کو صاف کر دیا تھا۔ اب آنکھوں کے سامنے سے شک و شبہات کے پردے ہٹ گئے تھے۔

امام غزالی نے دیکھا کہ دنیا کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ کسی کو مذہب میں پختہ نہ پایا۔ سب کے قدم دگمگا رہے تھے۔ اور روحانیت کی کمی سے دنیا

میں تاریکی پھیل چکی تھی۔ ارادہ ہوا کہ تنہائی کے عالم سے نکل کر خلق اللہ کو ہدایت کرس۔ اسی عرصہ میں بادشاہ وقت کا حکم بھی آ پہنچا کہ درس کی

خدمت قبول کیجئے۔ مقدس بزرگوں نے بھی تنہائی اور گوشہ نشینی ترک کرنے کی رائے دی اور آخر

۴۹۹ھ میں امام غزالی نے مدرسہ نظامیہ نیشاپور کی منہ درس پر بیٹھ کر بدستور پڑھانا شروع کر دیا۔

مخالفت کا زور۔ امام غزالی جتنے مشہور

ہوئے اتنے ہی ان کے دشمنوں کی تعداد بڑھی۔

علماء کے علاوہ صوفی بھی ”احیاء العلوم“ کی تصنیف کے بعد سے ان کے دشمن ہو گئے۔ ان پر کفر

و الحاد کے فتوے لگ گئے اور جب اس طرح ان کا کچھ بنا بگاڑ نہ سکے تو سلطان سنجر شاہ کو

ورغلان کر امام صاحب کو دربار میں طلب کرایا۔

امام غزالی فرمان سلطانی سے مجبور ہو کر دربار میں پہنچے۔ سلطان سنجر نے بڑی عزت کی۔ اپنے برابر تخت پر بٹھا لیا۔ مخالفین کا ذکر آیا اور ان کے الزامات بیان ہوئے امام صاحب نے بڑی جرات کے ساتھ سلطان کے سامنے تقریر کر کے مخالفوں کا دھڑ توڑ دیا اور باعزاز تمام اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔

امام غزالی کے نیشاپور میں درس دینے کی خبر بغداد پہنچی تو وزیر احمد بن نظام الملک نے امام صاحب کو وہاں بلوایا اور لکھا کہ ”آپ جیسے مقتدا زمانہ کا قیام بھی اسلام کے مرکز دارالسلام ہی میں زیبا ہے۔ لیکن امام صاحب نے عذر کیا اور لکھا کہ (۱) اس وقت جو طلبا نیشاپور میں پڑھتے ہیں ان کو بغداد جانے میں تکلیف ہوگی۔ (۲) میرے ساتھ اب بال بچوں کا جھگڑا لگ گیا ہے اور وہ گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ (۳) میں بحث مباحثہ سے قویہ کر چکا ہوں اور بغداد میں اس کے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ لہذا مجھے معاف رکھو۔ پھر سب سے آخری اور مشکل امر یہ ہے کہ میں تنخواہ اور وظیفہ لینا نہیں اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں۔ اس لئے گزر اوقات کا سامان کیا ہوگا؟

وفات :- بالکل اخیر عمر میں امام غزالی ریاضت و نفس کشی میں مصروف ہونے کے باوجود درس اور

تصنیف کا شغل بھی رکھتے تھے۔ اور کئی عمدہ کتابیں اس زمانہ کی تصنیف ہیں۔ امام غزالی نے ۱۷ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طابران دنیائے فانی سے سرائے جاودانی کا سفر اختیار کیا۔ ان کے بھائی احمد غزالی ان کی وفات کا قصہ یوں لکھتے ہیں کہ ”پیر کے دن امام صاحب نے صبح کے وقت بستر سے اٹھ کر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ پھر کفن منگوا کے آنکھوں سے لگایا اور کہا ”آقا کا حکم سر آنکھوں پر“۔ یہ فرما کر پاؤں پھیلا دئے اور روح پرواز کر گئی۔ لوگوں نے دیکھا تو کچھ بھی نہ پایا۔“ تمام اسلامی دنیا نے امام صاحب کی وفات پر حسرت کے آنسو بہائے۔ اور بہت سے مرثیے کہے گئے۔

اولاد:- امام غزالی کے لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ چند لڑکیاں تھیں۔ جن کی اولاد کا پتہ چلتا ہے * شاگرد:- بہت کثرت سے تھے۔ خود امام صاحب نے اپنے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار بیان کی ہے۔ ان میں سے ابو الحسن علی بن مسلم۔ جمال الاسلام بڑے زبردست فاضل تھے اور فاضل ابن عساکر وغیرہ انہیں کے شاگرد ہیں۔ محمد بن تومرت ہمدی مغربی بھی امام غزالی کا شاگرد تھا۔

تصنیفات:- اگرچہ امام غزالی نے کل ۵۴ برس عمر پائی اور اس میں بڑا زمانہ بچپن تعلیم اور تصوف کی ریاضت وغیرہ کا بھل گیا۔ پھر بھی شیخ رست میں

ان کی تصنیف کی ہوئی پائی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض کئی کئی ضخیم جلدوں میں تھیں۔ اور ہیں۔ اس لحاظ سے آپ نے سینکڑوں ہی کتابیں تصنیف کیں اور مختلف علوم و فنون میں +

مگر سب سے بڑھ کر مقبول اور لطیف تصنیف "اجیاء علوم الدین" ہے جو تصوف اور اخلاق میں اعلیٰ ترین پایہ کی کتاب مانی جاتی ہے۔ اور ہر زمانہ اور ہر ایک طبقہ کے علما اور حکما نے اس سے ایکساں لطف اٹھایا ہے +

فلاسفہ یونان اور ان کے مسائل کی تردید میں کتاب "تہافت الفلاسفہ" بہت نادر کتاب لکھی ہے + امام غزالی کی ایک عجیب تصنیف "جواہر القرآن" کا تلمی نسخہ میں نے دیکھا۔ یہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسائل دینی اور آیات قرآنی کو احکام حق و عقل سے مطابق کرنے کا امام ممدوح نے نہایت دلنشین پیرایہ اختیار کیا تھا +

امام غزالی فلسفہ و حکمت کے معانی سے بحث کرنا اپنا اصول ٹھہرا چکے تھے۔ وہ لفظوں اور ظاہری باتوں کی پابندی سے بری تھے۔ اور یہی روش انہوں نے اپنی متحد کتابوں میں اختیار کی ہے +



عمر خیام

نام و نسب :- عمر نام - غیاث الدین خٹاب - ابو الفتح کلبیت - اور ابراہیم الخیام کا بیٹا تھا - خیام شاید اس وجہ سے مشہور ہوا کہ اس کا باپ نیمہ دوزی کیا کرتا تھا :

نیشاپور میں پیدا ہوا اور وہیں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تکمیل علوم تک تمام علمی مرحلے طے کئے - عمر خیام کے وقت میں نیشاپور علم و فضل کا مخزن تھا - مدرسہ نظامیہ جس کی تعلیم نے امام غزالی جیسے علامہ زمانہ شخص پیدا کئے وہیں عمر خیام نے بھی تعلیم پائی - وہ اور حسن بن صباح فرقہ باطنیہ کا بانی اور وزیر نظام الملک طوسی تینوں ہم جماعت تھے - اور ان میں نہایت گہری دوستی تھی - ان کے آپس میں یہ قول و قرار ہو گیا تھا کہ جو شخص ان میں سے کسی اعلیٰ رتبے پر پہنچے وہ اپنے دو باقی ساتھیوں کا بھی ضرور خیال کرے - اتفاق کی بات ہے کہ نظام الملک سلطان الپ ارسلان شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم ہو گیا اور اس نے یہ عظیم الشان منصب پاتے ہی اپنے دونوں مکتبی یاروں حسن و ابوبکر عمر کو بھی دربار سلطانی میں اعلیٰ عہدے ولا دیئے کا ارادہ کیا - مگر جب خیام سے اس خیال کو ظاہر

کیا تو وہ اس سے یہ کہہ کر منکر ہو گیا کہ ”میں
تحقیق و اکتشافات علمیہ میں مصروف رہنے کے لئے
کفر بیگانہ زندگی پسند کرتا اور پھٹے حالوں میں رہنا ہی
بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ مادی ترقی عیش و عشرت دینا
پر مائل بنا کر روحانی جذبات کو دبا دیتی۔ اور کمال
کے جوہر کو بے آب و تاب بنا دیتی ہے“۔
مستی عیش و عالم کی نہیں پروا مجھے
دیکھنے والا ہوں اُس کے زنگیں مخمور کا
نظام الملک نے عمر خیام کو شاہی دربار داری کی
قید میں پابند ہونے سے قطعی انکار کرتے پایا اور
وہ سمجھا کہ

بک قلم بے سود ہے اظہار حال آرزو
اٹھن بے پروا کے آگے عشق نامنظور کا
تو آخری تجویز یہ نکالی کہ اس کو آزادی کے ساتھ
علمی خدمت کرنے کا کافی موقع دیا جائے اور خزانہ
عامہ سے اس کی گزر اوقات کے لئے سواشرفیاں
ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ اور یہی انتظام کر دیا۔
عام طور پر عمر خیام ایک صوفی منش شاعر مانا
جاتا ہے اور اس کی رباعیات کی قدر ایشیا سے
زیادہ یورپ میں کی جاتی ہے۔ لیکن دراصل وہ
ایران کا نامور ریاضی دان اور ہیئت دان فیلسوف
و حکیم تھا۔ علوم فلسفہ و حکمت میں اس کا درجہ
مخبر الرشید بوعلی سینا سے کم نہ تھا۔ مگر بد مزاجی

اور کچھ خلقی نے اس کو ہر دلعزیز نہیں بنایا اور اہل علم کا اس سے میل ملاپ نہ رہا۔ جب علما اور طلبا اس کے پاس کم جاتے تھے تو کیا صورت تھی جس سے اس کو شہرت حاصل ہوتی ؟

گو عمر خیام کی یہ خاموشی اور عزت پسندی اس کی طبیعت میں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ لیکن نیشاپور کی علمی صحبتوں میں اس کا گزر ہوتا ہی رہا اور اس کی ریاضت دانی کا جوہر کھلتا ہی گیا۔ رفتہ رفتہ یہ شہرہ ملک شاہ سلجوقی فرمانروا نیشاپور کے دربار تک پہنچا اور وہ اس کا قدردان بن گیا ؟

عمر خیام کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ اصفہان میں ایک کتاب اس نے سات مرتبہ دیکھی تھی۔ نیشاپور آکر وہ ساری کتاب محض یاد کی مدد سے لکھ ڈالی۔ اور اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے پر سب سے فرق نہ نکلا ؟

سلطان ملک شاہ سلجوقی۔ اور امیر شمس الملوک بخاری۔ دونو حکیم عمر خیام کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے اور اس کے علم ہیئت میں کمال سے واقف تھے۔ ملک شاہ نے اس کے اس کمال سے فائدہ اٹھانے کا قصد کیا اور ^{۱۰۰۰}۱۰۰۰ روپیہ میں اُسے اس علم کی تحقیقات پر مامور کیا اور اس زمانے کی موجودہ جنسریوں میں کامل اصلاح کرنے کا اہتمام

تقویض فرمایا۔ عمر خیام نے جس خوبی سے یہ علمی خدمت انجام دی وہ اسی کا حق تھا۔ اور اس سے ملک شاہ کو بھی اپنے انتخاب پر ناز ہو گیا۔ عمر خیام نے فارسی قدیم تقویم کی غلطیاں ثابت کر کے اس کی پوری اصلاح کر دی۔ آج ایشیا کے علم دوستوں سے بڑھ کر اہل یورپ اس حکیم کی رباعیات کے قدردان پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات ان میں بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایشیا میں عمر خیام کی ہیئت دانی بے مثل تھی۔ تاریخ جلالی کی بنیاد عمر خیام ہی نے ملک شاہ سلجوقی کے لئے ڈالی تھی اور ۱۰ مارچ ۱۰۷۹ء سے اس تاریخ کا آغاز کیا تھا۔ ورنہ اس سے قبل ایران میں یزدجردی سنہ جاری تھا۔

عمر خیام نے یزدجردی سنہ کے حساب کی پرتال کر کے معلوم کیا کہ سال شمسی کی فصلیں اپنے ٹھیک وقت سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے دریافت کیا کہ شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ اور ۴۲ د ۴۹ سکند کا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایران میں یزدجردی سال صرف ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا جس کی تقسیم بارہ مہینوں پر تھی اور ان میں سے گیارہ مہینے فی ۳۰ دن کے اور بارہواں مہینہ اسفندار ۳۵ یوم کا قرار پایا تھا۔ لہذا کسرات کا اضافہ ہوتے ہوتے فصل و موسم کا زمانہ اپنے موقع سے ٹل گیا تھا اور

حساب میں سخت غلطی پڑی ہوئی تھی۔ عمر خیام کو محسوس ہوا کہ جب تک یہ کسریں سال کے دنوں پر بڑھائی نہ جائیں گی سنہ کا حساب ہرگز ٹھیک نہ آسکے گا۔ اس نے یہ طریقہ نکالا کہ ہر چوتھے سال ماہ اسفندیار میں ایک دن بڑھا دیا کرتا۔ سات مرتبہ ایک یوم کا اضافہ ہر چوتھے سال کرتا اور آٹھویں مرتبہ یہ اضافہ پانچویں سال میں کیا جاتا۔ چنانچہ اس ترکیب سے فصل و موسم کا حساب ٹھیک بیٹھ گیا۔ اور اب ۳۳ شمسی سال ۳۴ قمری برسوں کے برابر ہو گئے۔ اور ہر ایک موسم بھی اپنے موقع پر آ گیا۔

شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر شاہ کے وقت میں یہی ماہ جلالی ماہ الہی کے نام سے تبدیل ہو گیا اور یہ اب تک نظام گورنمنٹ میں برابر جاری بھی ہے۔ خیام کی طبیعت پر فلسفیانہ رنگ غالب تھا۔ وہ رند مشرب اور آزاد تھا۔ دیندار جماعت ایسے شخص کو اچھا نہیں خیال کر سکتی۔ عمر کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوا۔ اس کو ملحد کہا گیا اور اس پر حد سے زیادہ جج و قج ہوئی۔ عمر خیام نے دیکھا کہ اہل ظاہر اس کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں اور ان کا منہ جب ہی بند ہوگا کہ میں ان کے سامنے سے ٹل جاؤں۔ تو وہ تمام سارے سامانِ دنیا اور علمی مشاغل چھوڑ کر حج بیت اللہ اور زیارت قبر رسول صلعم کے لئے چل نکلا۔ حج و زیارت سے فراغت کر کے بغداد آیا۔ اہل

بغداد اس کے کمال کا شہرہ من چکے تھے۔ اس سے فیض اٹھانے کے لئے اس کو گھیرنے لگے۔ عمر خیام کاموں اور روکھے پن سے کام لیتا رہا۔ مگر یوں پیچھا نہ چھوٹا تو مجبور ہو کر صاف صاف کہ دیا کہ ”بھائی مجھے کیوں ستاتے ہو میں نے علوم قدیمہ کا مشغلہ چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ اس کے مطالعہ سے بھی دل کھٹا ہو گیا ہے۔“

وقت طلوع دیکھا۔ وقت غروب دیکھا

اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

خیام کا رنگ طبیعت سفرِ ارض مقدسہ شروع کرتے ہی بدل چکا تھا۔ رندی کی جگہ پارسائی اور آزاد خیالی کے بجائے معرفتِ الہی کی اُمتنگ دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ تسبیح و عبادت سے کام اور یہی شغل مدام رہتا۔ صوفیائے کرام اس کی طبیعت کا رخ پہلے ہی تاڑ چکے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کسی نہ کسی وقت شرابِ ناب کو چھوڑ کر مے وحدت کا جرعه کش اور خزانہ معرفت کا رند خراباتی بن جائیگا۔ اور یہی ہوا۔ کتاب ”مجمع النواہر“ کے مصنف نے عمر خیام کا ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”سنہ ۵۰۰ھ میں حکیم عمر خیام اور مظفر اسفرانی۔ دونو ساتھ مل کر شہر بلخ میں آئے اور امیر ابوسعید کے مہمان ہوئے۔ بن ان سے ملنے ہر روز جایا کرتا تھا۔ ایک دن انہوں باتوں میں حکیم عمر خیام نے بیان کیا۔ کہ ”میں

ایسی جگہ دفن کیا جاؤنگا جہاں ہر سال بہار کے موسم میں باد بہاری میری قبر پر پھول نثار کرتی رہیگی۔ کتاب مجمع النوادر کا مؤلف کہتا ہے کہ ”میں نے حکیم خیام کی اس بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور خیالی کر لیا کہ موت کا وقت اور اس کی جگہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حکیم عمر خیام نے ایسی بات کیوں کہی۔ مگر ایک زمانہ کے بعد ^{۱۰۳۵ھ} میں مجھ کو نیشاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ اُس وقت حکیم عمر خیام جو میرے استاد بھی تھے فوت ہو چکے تھے میں ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کی تربت ایک باغ کی چار دیواری تلے پھولوں کے درختوں کے جھرمٹ میں ہے اور اس پر اتنے پھول گرے ہیں کہ وہ بالکل ان کے نیچے چسپ گئی ہے۔ مگر حال میں ایک انگریز سیاح نے جو نیشاپور کی سیاحت کو گیا تھا لکھا ہے کہ ”افسوس حکیم عمر خیام کی قبر نہایت بیکسی اور کس پرسی کے عالم میں ویران پڑی ہے۔ بجز اس کے کہ باد بہاری اس پر پھول اور بادِ خزاں خشک پتے نثار کرے۔ اور کوئی اس کا پُرساں حال نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اہل وطن شیعہ ہیں اور عمر خیام سنی تھا۔ لہذا وہ اس کی قبر کی مرمت نہیں کرتے۔“

عمر خیام کی رباعیات مشہور زمانہ ہیں اور ان کا ترجمہ دنیا کی کئی زندہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اہل

یورپ جن کو کمال اور اہل کمال کی بڑی تلاش رہتی
ہے وہ اس حکیم کے نہایت مداح ہیں۔ اور انہوں
نے ایک خاص کلب ”قیام کلب“ کے نام سے اسی
جگہ کی یادگار میں قائم کر رکھا ہے۔ جہاں ہر سال
اس کی وفات کے دن ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا
کرتا ہے +

حکیم عمر خیام کی رباعیاں اخلاق و حکمت سے بھری
ہوئی اور بحدہ مؤثر ہیں۔ نمونہ چند رباعیاں ذیل میں
درج کی جاتی ہیں۔ کہتا ہے :-

رباعی

گویند بحشر گفتگو خواہد بود و اں یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود
دیگر

دل تنگ مشو کہ تا جہاں خواہد بود از تو بجہاں نام و نشان خواہد بود
تا چرخ اشیر و اختران سیر کنند نقد تو خلاصہ جہاں خواہد بود
تغییرات عالم پر یہ رائے ظاہر کی ہے

روزے فلکم جامہ دہد میر کنند روزے دگرم برہنہ چوں سیر کنند
با چوں و چراے فلکم کارے نیست غم خوردن بیہودہ مرا پیر کنند
خدائے تعالیٰ سے اُمید مغفرت

گہ تخت سلیمان بہ لیٹھے بخشی گہ تلخ نبوت بہ یقیتمے بخشی
یارب چہ شود اگر مرا بے سببے از روضہ مغفرت نیستے بخشی
عمر خیام نے سلسلہ میں وفات پائی۔ اور اپنے
وطن نیشاپور میں ہی مدفون ہوا +

تصانیف :- عمر خیام کی تصانیف میں ایک کتاب ”تاریخ جلالی“ ہے یہ جلال الدین ملک شاد سلجوقی کے ایما سے لکھی گئی اور اسی کے نام سے موسوم ہوئی +
 (۲) رسالہ جبر و مقابلہ +
 (۳) معلقات حدود اقلیدس +



ابن رشد

نام و نسب :- محمد نام - الولید کنیت -
 سلسلہ نسب ”محمد بن احمد بن محمد بن رشد“ ہے -
 اور ”ابن رشد“ کے نام سے شہرت پائی +
ولادت :- ۱۱۵۰ء میں مطابق ۱۱۵۰ء میں بمقام شہر ”قرطبہ“ پیدا ہوا - قرطبہ وسط اندلس کا پایہ تخت اور علم و ہنر کا گھر تھا - ابن رشد کے باپ اور دادا دونوں یہاں کی قضاوت پر مامور رہ چکے تھے +
تربیت و ابتدائی تعلیم :- اپنے وطن اور جملے ولادت شہر قرطبہ ہی میں پائی - ذہن و حافظہ کے ساتھ علم و کمال کا شوق اور طبیعت کی تیزی خدا داد تھی - دستور زمانہ کے موافق زبانہائی - قرآن کریم - اور علم فقہ کی تعلیم پہلے حاصل کی - ابتدائی تعلیم میں اس کا استاد حافظ ”ابی محمد بن زرق“ رہا - اور پھر عقلی علوم کی تعلیم ”ابن طفیل“ اندلسی سے حاصل

کی۔ ابن رشد کو علم توحید یعنی عقائد اسلام۔ فقہ۔ فلسفہ۔ طب اور ریاضیات میں اپنے زمانے کا بے مثل عالم مانا گیا ہے ۛ

مراکش اور اندلس کے نامور حکمران خاندان موحدین کے بادشاہوں نے اس کی بہت کچھ قدر اور عزت کی تھی۔ یہ خاندان مغرب کے اس کامیاب شخص کا تھا جس نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور مذہبی طاقت سے کام لے کر دنیا کی سلطنت و حکومت حاصل کی۔ اس مدعی مہدویت کا نام محمد بن تومرت تھا۔ اور اس نے امام ابو حامد الغزالی ج کی خدمت میں تحصیل علم کی تھی۔ جب محمد بن تومرت سرزمین افریقہ میں آیا تو عبدالمومن بن علی نامی ایک ہوشیار اور مستعد شخص اس کا رفیق بن گیا جس نے محمد بن تومرت کے ارادوں میں اس کی بہت قابل قدر مدد کی اور جس وقت ابن تومرت مہدی موعود ہونے کا مدعی ہوا اور اس نے اس دعوے میں کامیابی حاصل کر کے مغرب اقصیٰ یعنی ملک مراکش میں اپنی زبردست سلطنت قائم کرنی تو اس کی وفات کے بعد عبدالمومن بن علی ہی اس کا خلیفہ اور جانشین بنایا گیا۔ اور یہ خاندان یا گروہ ”موحدین“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان حکومت میں ”ابو یعقوب“ اور اس کا بیٹا یعقوب المنصور دو نہایت زبردست فاتح بادشاہ ہوئے۔ انہی دونوں کے دربار میں ابن رشد کا

آفتاب علم و فضل چمکا اور وہ سلطان ابویقوب یوسف کے عہد میں بہت سے ممتاز ملکی عہدوں پر مقرر ہوتا رہا +

۵۶۵ھ میں ابن رشد اندلس کے مشہور شہر "شبیلیہ" کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مامور ہوا۔ مگر علی مذاق اس کو مجبور کرتا تھا کہ اس جلیل عہدہ کے نازک اور کثیر فرائض ادا کرنے کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھے۔ اس کا قیمتی کتابوں کا ذخیرہ شہر قرطبہ میں اس کے مکان پر تھا۔ اور اس نے بالکل اپنی یادداشت سے کام لے کر حکیم ارسطو کی کتاب الحيوان پر شرح لکھ ڈالی۔ کتاب کے دیباچہ میں اس نے یہ عذر بھی کر دیا ہے کہ۔ کتب خانہ قرطبہ میں ہونے کی وجہ سے کسی اور کتاب سے مدد نہیں لے سکتا محض یادداشت کی امداد سے جو کچھ بن پڑا وہ لکھ دیا ہے۔ اگر شرح میں کہیں غلطی ہوئی ہو تو معافی کا اُمیدوار ہے۔ اور اسی زمانہ میں اس نے حکیم بطليموس کی کتاب "مجسطی" کا بھی خلاصہ کیا تھا +

اس زمانہ میں ابن رشد کو اکثر دورہ بھی کرنا پڑتا۔ وہ کبھی مراکش جاتا اور کسی وقت قرطبہ - شبیلیہ میں جم کر رہنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اور وہاں قیام کے دنوں میں مقدمات کی سماعت کا کام کرنا پڑتا تھا جو کچھ اس کی غیر حاضری کے زمانے

کا جمع شدہ ہوتا اور کچھ تازہ نالشیں ہوا کرتیں مگر اتنی کثرت کار کے باوجود وہ برابر تصانیف میں مشغول رہا۔ اس نے ایک کتاب دینیات پر بھی اسی زمانہ میں لکھی لیکن افسوس ہے کہ آج اس کتاب کا نام تک معلوم نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ وہ کتاب کہیں ملتی ہو +

ابن رشد کے علم و کمال کا شہرہ اندلس کے حدود سے نکل کر افریقہ کے ریگستانوں کو طے کرتا ہوا مشرق کے مالک تک پہنچا اور امام فخر الدین رازی ج جو اُس وقت ایشیا میں بے نظیر صاحب کمال اور امام وقت تھے ان کو اپنے بلند پایہ مغربی معاصر کا حال معلوم ہوا تو اُس سے ملنے کے ارادہ سے ”اسکندریہ“ (مصر) پہنچے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسکندریہ پہنچ کر ان کو ابن رشد کے ساتھ زمانے کی بے مہری کا حال دریافت ہوا اور اُنہوں نے سنا کہ امیر ”منصور“ نے اس نامور حکیم کو چند غلط تہمتوں کی بنا پر قید میں ڈال دیا ہے۔ امام رازی یہ خبر سن کر مجبوراً اپنے قصد سے باز آئے اور وطن اصلی کو پلٹ گئے +

ابن رشد کے قید ہونے کا واقعہ یہ تھا کہ اس کے فلسفیانہ خیالات اور پر زور عقلی دلائل کی کُنہ ملک اندلس کے دوسرے علما کی سمجھ میں نہ آئی تو اُنہوں نے اس پر الحاد اور بے دینی کا الزام عاید

کر دیا اور مختلف طریقوں سے امیر "یعقوب المنصور" کو اس کی جانب سے بھڑکا کر آخر کار اسے معتبہ بارگاہ بنا دیا۔ امیر منصور نے ابن رشد کو جلا وطن کر کے مقام "لوسینا" میں رکھا جو خالص یہودیوں کی بستی تھی ۛ

اور ابن ابی اصیبعہ اپنی کتاب طبقات الاطباء میں ابن رشد کے معتبہ بارگاہ ہونے کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ جس وقت ۹۱۱ھ میں امیر "یعقوب المنصور" قرطبہ میں آیا اور اس وقت وہ کیپٹل کے عیسائی فرمائرو الفانسو پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا تو اس نے ابن رشد کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اور اس کی اتنی عزت و حرمت کی کہ اپنے قریب بٹھا کر امیر ابو محمد عبد الواحد پر بھی اسے بڑھا دیا جو منصور کے دربار کا نہایت معزز رکن اور موصوفین کے فرقہ میں سب سے بڑھ کر با رسوخ آدمی تھا۔ ابن رشد سلطان کے دربار سے باہر نکلا تو طلباء اور دوستوں کی کثیر جماعت نے جو اس کے انتظار ہی میں استاد تھے اسے مبارکباد دی۔ ابن رشد نے ان کو جواب دیا۔ کہ "یہ امر مبارکباد دینے کے قابل نہیں بلکہ اس سے مجھ کو سخت خطرہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ سلطان نے ایک دم سے مجھے اتنا مقرب بنا لیا جس کی مجھ کو ہرگز اُمید نہ تھی۔ اور یہ بات دوسرے درباری امرا کو یقیناً پسند نہیں آئی ہے۔"

ابن رشد کے دشمنوں نے شہر میں یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ سلطان نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہذا ابن رشد نے دربار سے بھٹکتے ہی ایک ملازم اپنے گھر پر روانہ کیا اور گھر والوں سے کہلا بھیجا کہ اس کے لئے چوزہ کی یخنی تیار کر رکھیں۔ اس فرمایش کا مطلب یہ تھا کہ اس کے عزیزوں اور متعلقین کو اس کی سلامتی کا اطمینان ہو جائے اور وہ پریشانی سے نجات پائیں +

غرضکہ ایسی ہی وجہوں سے درباری امرا اور علما ابن رشد کے دشمن ہو گئے اور مذہب کی آڑ میں اسے نیچا دکھلا کر جلا وطن کرا دیا۔ ”لوسینا“ شہر قرطبہ کے متصل ایک گاؤں تھا ابن رشد وہاں حالت جلا وطنی اور حراست میں تین سال سے زائد عرصے تک مقیم رہا۔ اس مدت میں بھی اس نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا اور بہت سے یہودی طلباء نے اس سے حکمت و فلسفہ کے علوم پڑھے۔ چنانچہ ان ہی یہودی شاگردوں کے ذریعہ سے ابن رشد کا فلسفہ دنیا بھر میں پھیلا اور مغربی ممالک کو عقل و دانش کے نور سے منور بنانے کا سبب ہو گیا +

اگرچہ ابن رشد کے شاگردوں میں ایک سو سے زائد لائق مسلمان علما بھی تھے لیکن سچ یہ ہے کہ علوم حکمیہ کے متعلق جیسا نکتہ رس اور غیر معمولی دماغ

قدرت نے ابن رشد کو مرحمت کیا تھا۔ ایسا اس کے کسی مسلمان شاگرد کو نہیں مل سکا۔ اور دیگر مسلمانوں نے تو اس پر کفر و الحاد کا فتوے لگا دیا تھا۔ اس لئے فلسفہ ابن رشد کی مسلمان علما کچھ بھی خدمت نہ کر سکے۔ بلکہ اس حکیم کے دماغی کارناموں کو جو کچھ فروغ ہوا وہ انہی یہودی عالموں کی جد و جہد کا نتیجہ تھا۔ جنہوں نے ابن رشد کی چند سالہ صحبت سے فیض پایا تھا اور انہوں نے اپنے فاضل استاد اور بے مثل حکیم کی کتابیں عربی سے عبرانی اور دیگر زبانوں میں منتقل کر کے یورپ میں رواج دیں۔ اور ابن رشد کے علم و کمال کی جو خدمت ان یہودیوں سے بن پڑی وہی اس کے بقا کا ذریعہ ٹھہری *
مسلمانوں میں اس نامور فیلسوف کے فلسفہ کا فروغ یوں نہ ہو سکا کہ خود اس کے اور اس کے شاگردوں کے عہد میں فلاسفہ پر بے دینی کا الزام عائد ہوتا اور ان کو طح طح سے ستایا جاتا تھا اور وہ ہر طرح سے حقیر و ذلیل سمجھے جاتے تھے لہذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص فلسفہ اور عقلی علوم سے پہلو بچلنے لگا اور ابن رشد کے شاگرد بھی فلسفہ اور ریاضیات کے مشغلہ سے دست بردار ہو گئے *
ابن رشد کے مسائل نے یورپ پر بہت کچھ اثر ڈالا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام مسائل حکیم

ارسطو کے فلسفہ میں موجود تھے اور صرف عبارت میں دقت لوگوں کو ان کے سمجھنے میں عاجز رکھتی تھی۔ ابن رشد نے ارسطو کے انہی مسائل کو اپنی زبان اور عبارت میں اس خوبی اور شستگی کے ساتھ بیان کیا کہ وہ سمجھ میں آنے کے قابل ہو گئے اور لوگوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔

ابن رشد نے شیخ الرئیس ابن سینا کی کتابوں پر بڑی تحقیق کے ساتھ شرحیں لکھیں اور بہت سے مقاموں میں شیخ پر ایسے اعتراضات کئے کہ شیخ کے بڑے نامی گرامی مقلد اور ماننے والے بھی ان اعتراضات کے رفع کرنے سے عاجز آ گئے اور شیخ کا سب سے بڑا پیرو خواجہ نصیر الدین محقق طوسی اپنی کتاب شرح اشارات میں ایک ایسے ہی موقع پر سخت مجبور ہو کر آخر یہ کہ اٹھا ہے کہ ”علم حکمت کے کلی قاعدے بھی دیگر علوم کی طرح اپنے اندر کچھ مستثنیات رکھتے ہیں۔ اور حکیموں کو ایسی صورتیں پیش آ جانے کے وقت مان لینا پڑتا ہے کہ بعض امور ان کے مقرر کئے ہوئے عام اور کامل اصول کے تحت میں نہیں آتے۔“

ابن خلکان جو ایک نامور اور عالم مورخ ہے۔ ابن رشد کے بارہ میں لکھتا ہے کہ ”ابن رشد مسائل فلسفہ کو اصول شریعت کے ساتھ مطابق کرنے کی سعی کیا کرتا تھا“ چنانچہ اس کا ایک مختصر رسالہ راسی

باب میں راقم کی نظر سے بھی گزرا ہے۔ اور یہاں اس بات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ سائنس و مذہب میں تطبیق کرنے والے ہر زمانہ اور ہر وقت میں پھرنے خیال والوں کی طرف سے الحاد اور بے دینی کا خطاب پاتے رہے ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں مرحوم سرسید احمد خاں ج پر اسی وجہ سے کفر و الحاد کا فتوے لگا۔ اور قدیم خیال کے علما نے ان کو اپنے نزدیک اسلام سے بالکل خارج کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اُردو زبان میں جدید اسلامی علم کلام کے بانی ہوئے ہیں اور جس خوبی کے ساتھ انہوں نے یورپ کے مادی علما و حکما کے مسائل کی اصول شریعت اسلامیہ سے تطبیق کی ہے وہ کچھ انہی کا حصہ تھا +

ابن رشد طبیب بھی تھا۔ اس نے علم طب میں ”کلیات“ نامی کتاب بڑے پایہ کی لکھی تھی۔ اس کتاب کا اصل نسخہ شاید ہی کہیں ہو۔ بظاہر اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ لیکن اس کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ اور ایسے ہی ابن رشد کی اکثر تصانیف عبرانی و لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہونے کے سبب سے محفوظ رہیں +

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں مسلمانوں نے تو ابن رشد کے فلسفہ سے بیزار ہو کر اسے پھٹوا تک نہیں۔ مگر ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے

اس کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا اور اُن پر شرحیں لکھیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت ابن رشد کے یہودی شاگرد عقلی علوم کے محافظ اور میدان علم و کمال کے شہسوار تھے۔ انہوں نے لاطینی زبان میں ابن رشد کی کتابوں کا عمدہ ترجمہ کیا اور اس طرح اندلس کے اس مسلمان فیلسوف کے مسائل اہل یورپ تک پہنچائے۔ اور یوں علم کی قابل قدر خدمت انجام دی *۔

یورپ کا عہد جاہلیت مذہبی پیشواؤں کی مطلق العنان اور جابرانہ حکومت کا تختہ مشق تھا۔ ابن رشد حکومت کا تختہ مشق تھا۔ ابن رشد کے فلسفہ میں ایسے مسائل موجود تھے جو دین عیسوی کے اصول کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اس لئے یورپ کے بعض علما اس کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے ابن رشد کا تتبع اختیار کیا۔ اس سے اُن کے عقلی اور ذہنی قوے میں تلازگی آئی اور وہ کلیسیا کے رواجی احکام کی مخالفت پر نکل گئے۔ چرچ کے اراکین یہ حال دیکھ کر گھبرائے اور اپنے حلوے مانڈے میں فرق آنے کے خیال سے علم و حکمت کی دشمنی اپنا ضروری فرض سمجھ لیا۔ ابن رشد کے فلسفہ کا پڑھنا اور پڑھانا ممنوع قرار دیا گیا۔ اور ”رشدانی“ یعنی وہ حکما جنہوں نے

فلسفہ ابن رشد سے استفادہ کیا تھا گردن زدنی پھیل گئے۔ لیکن جن طبیعتوں کو اس فلسفہ کا ذوق ہو گیا تھا۔ وہ اس سے باز نہ رہیں۔ اور پادریوں نے اس آگ کو بجھانے میں جتنا زیادہ زور لگایا یہ اتنی ہی تیزی سے اور بھڑکی اور بہت جلد تمام ملک میں پھیل کر فرقہ پرور ٹنٹ کی بانی ہوئی جس نے کلیسیا کی اصلاح پر کمر باندھی اور آخر کار یورپ کو ورطہٴ جہالت سے نکال کر علم و تمدن کے روشن میدان میں پہنچا دیا۔ اور اس طرح فلسفہ ابن رشد مغربی فلسفہ و سائنس کی بنیاد بن گیا۔

مسیحی حکما نے فلسفہ ابن رشد کو دین عیسوی کے مروجہ اصول کا برہم زن اور دہریت کا بانی محسوس کرنے کے باوجود حاصل کیا اور اس کی اشاعت میں کوشاں ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ فلسفہ ان کی دماغی اور عقلی قوتوں کو ابھارنے میں مفید ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے ابن رشد کو ارسطو کا ہمسر مانا اور اس کے سائل حکمت کو اپنا مشعل راہ بنایا۔ مگر سخت تاسف اور حسرت کا مقام ہے کہ مسلمانوں میں اس بے شل حکیم کا ایک بھی نام لیوا نہ رہا۔ اور انہوں نے اس کو اپنے گوشہٴ خاطر سے نکال کر خود ہی اپنی تنہا ہی اور علمی بے مانگی کا سامان فراہم کر لیا۔

ابن رشد سات سال تک ”ایسانہ“ یا ”لوسینا“

میں نظر بند رہ کر ۹۵ھ میں پھر آزاد کیا گیا اور
 امیر ”منصور“ نے اس سے خوش ہو کر اسے مراکش
 میں باعزاز تمام بلوایا اور بدستور سابق دربار میں جگہ
 دی۔ مگر اس نامور فیلسوف کی زندگی نے دقانہ کی
 اور وہ مراکش پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۹ صفر
 ۹۵ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۹۵ھ کو دُنیا سے عالم
 آخرت کی طرف سدھار گیا ۛ

ابن رشد کے کئی بیٹے اس کی یادگار تھے۔ بڑا
 بیٹا ابو محمد عبداللہ نامی نہایت حاذق طبیب تھا۔ اور
 اس کے علاوہ دوسرے کئی ایک فرزند علوم دین کے
 اچھے عالم تھے جو قضاوت کے عہدوں پر مامور
 ہوئے ۛ

ابن رشد کا قول ہے کہ ”علم تشریح کا جاننے
 والا خدا پر بہت کامل ایمان رکھتا ہے“ ۛ

امام فخر الدین رازی

نام و نسب :- محمد نام - فخر الدین لقب -

ضیاء الدین عمر کے بیٹے - اور شہر رے کے رہنے والے

تھے - سلسلہ نسب یہ ہے - محمد بن عمر بن حسین بن حسن

بن علی البیہقی البکری - اور مشہور نام ”ابن خطیب الرے“

ہے - مذہب شافعی ہے کے پیرو اور علم کلام معقولات -

اور فلسفہ حکماء یونان میں اعلیٰ درجہ کے کامل اور اپنے زمانے میں بے نظیر شخص تھے ۛ
ولادت و تعلیم :- ۛ مطابق ۷۷۱ھ میں بمقام شہر رے پیدا ہوئے۔ ابتدائی علوم اپنے والد ماجد ضیاء الدین عمر سے پڑھے جو کہ شہر کے خطیب اور نامور عالم تھے۔ اور معقولات کی تعلیم ”مجد الدین جبلی“ سے حاصل کی جو عقلی علوم کے اچھے ماہر اور اس ملک میں مشہور شخص تھے۔ امام فخر الدین نے اپنے اسی استاد کے ساتھ رے سے مراغہ کا سفر کیا اور وہاں عقلی علوم کی تکمیل کرتے رہے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں دور تک ان کی علمی لیاقت کا شہرہ پھیل گیا اور فراغت کے بعد ناموری کا سچھ اور ہی رنگ ہوا ۛ

شہرت و عہد :- کا دور شروع ہوتے ہی تصانیف کا بھی آغاز کر دیا تھا اور درس دینے میں مصروف رہتے۔ استاد کی خدمت سے جدا ہو کر وسط ایشیا کے ہر ایک شہر اور مشہور قصبہ کی سیاحت فرمائی ہر جگہ درس کی مجلس گرم کی۔ نہایت خوش بیان اور مقرر تھے۔ ان کی تقریر کا سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ خود ان پر وعظ کہتے ہوئے وجد کی کیفیت طاری ہوتی۔ آپ روتے اور سننے والوں کو بھی مڑلاتے یہ باتیں ایسی نہ تھیں جو ان کے نام کو نہ اچھالیں۔ وہ مشہور ہوئے اور خوب شہرت پائی۔ دور دور سے بڑے بڑے عالم

ان کی خدمت میں علی فائدہ اٹھانے کے واسطے آنے لگے۔ ان کی تصانیف کو ایسا رتبہ حاصل ہوا کہ لوگوں نے اگلے علما اور حکما کی کتابیں چھوڑ کر ان کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا اختیار کیا۔ ان کی مجلس وعظ میں ہر ایک مذہب و مشرب کے آدمی آیا کرتے اور سوال و جواب ہوتے رہتے بہت سے بد عقیدہ اشخاص نے ان کے ہاتھوں پر توبہ کی اور اہل سنت کا مذہب اختیار کیا۔

ابتدا میں طبیعت علم کلام کی طرف مائل تھی۔ عقائد دین کی فلسفہ سے مطابقت کرنے کا خیال اتنا بڑھا کہ ان کے اقوال سے پُرانے خیال والے برافروختہ ہونے لگے۔ اور بہت سے جھگڑے پیش آئے پہلے شہر خوارزم میں علما سے مباحثہ ہوا اور ان کے عقائد و خیالات سے ناراضی بڑھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کو وہاں سے نکالا گیا۔ امام فخرالدین خوارزم سے ملک ماورالنہر میں چلے گئے مگر وہاں بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ آخر مجبور ہو کر اپنے اصلی وطن شہر رے میں پہنچے اور وہاں قیام کیا۔

دربار رسی :- شہر رے میں ایک اعلیٰ درجے کا طبیب نہایت دولتمند تھا۔ اس کے دو لڑکیوں کے سوا کوئی اولاد نہ تھی۔ اور امام فخرالدین کے دو فرزند تھے۔ وہ طبیب سخت بیمار اور مرض الموت میں گرفتار ہوا تو اُس نے امام فخرالدین کے دونوں بیٹوں

سے اپنی لڑکیوں کی شادی کر دی - اور پھر وہ فوت ہو گیا - اس طرح امام فخرالدین ایک دولت مند شخص بن گئے - اور اب انہوں نے سفر و سیاحت شروع کی - غزنی کے فرمانروا شہاب الدین غوری کے یہاں ان کے مرحوم سمہی کا کچھ مطالبہ تھا - اپنا حق لینے کی غرض سے سلطان مذکور کے پاس گئے تو سلطان نے ان کی بہت کچھ عزت و حرمت کی اور کثیر رقم انعام میں دی - غزنی سے امام فخرالدین خراسان کو گئے - اور سلطان "محمد تمکش" معروف بخوارزم شاہ کے دربار میں ان کی کمال عزت و توقیر ہوئی - وہاں اعزاز و اکرام کے ساتھ کچھ زمانہ تک مقیم رہے اور مال و دولت سے بھرپور ہو گئے *

امام فخرالدین نے دربار خوارزم شاہی میں وہ رتبہ پایا کہ کسی اور آدمی کو ایسا مرتبہ نصیب نہ ہو سکا - سلطان خوارزم شاہ ان کی بہت کچھ تعظیم کرتا تھا - اور اکثر اہم معاملات میں ان کی رائے پر عمل کیا کرتا تھا *

امام فخرالدین کا ایک بڑا بھائی کچھ سوداگر اور لا اُبابی مزاج تھا - اس کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ چھوٹے بھائی کو اس قدر شہرت اور عزت حاصل ہے اور خود اسے کوئی بھی نہیں پوچھتا - امام فخرالدین اپنے حاسد بھائی سے عمدہ سلوک بھی کرتے تھے لیکن جس قدر یہ اس کی خاطر اور خدمت کرتے اتنا ہی وہ ان سے اور زیادہ جلتا اور خار کھایا کرتا - امام

فخرالدین نے بہت کوشش کی کہ ان کا بھائی اپنی فضول حرکتوں سے باز آ جائے مگر وہ کب ماننا تھا۔ جہاں موقع ملتا لوگوں سے کہا کرتا کہ ”میں بڑا اور ہر طرح فخرالدین سے اچھا ہوں لیکن نہیں معلوم خلقت کو فخرالدین سے کیوں اس قدر عقیدت ہے اور میری کہیں پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کی عادت تھی کہ جا و بیجا ہر وقت امام فخرالدین کی بُرائیاں لوگوں سے بیان کرتا رہتا۔ امام فخرالدین نے دیکھا کہ ان کے دیوانہ بھائی کی دیوانگی ترقی ہی کرتی جاتی ہے تو انہوں نے خوارزم شاہ سے کہہ کر اسے نظر بند کرا دیا اور ایک قلعہ میں اس کو قید کرا کے ہزار اشرفی سالانہ وظیفہ اس کے لئے مقرر کر دیا۔ چنانچہ وہ زندگی کے باقی دن اسی قلعہ میں بسر کر کے وہیں وفات پا گیا۔

مجلس درس :- امام فخرالدین کا حلقہ درس بہت ہی شاندار ہوتا تھا اور وسیع اس قدر تھا۔ کہ سینکڑوں طلباء ان کے درس سے فیض اٹھاتے۔ حلقہ درس میں ترتیب یہ ہوتی تھی کہ بڑے بڑے لائق اور نامی گرامی طلباء امام کے پہلو میں بیٹھتے۔ مثلاً زین الدین کچھی۔ قطب الدین مصری۔ اور شہاب الدین نیشاپوری وغیرہ۔ پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ اور طلباء بیٹھا کرتے تھے۔ درس کے وقت جس کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی اس کا جواب پہلے یہی مذکورہ بالا شاگرد دیا کرتے تھے اور جب ان سے جواب نہ آتا اس وقت خود امام

فخر الدین تقریر فرماتے اور علی مسائل کا صحیح مفہم اُن کے ذہن نشین کر دیتے +

حلیہ :- امام فخر الدین متوسط القامت شخص تھے - بدن بوٹی چڑھا ہوا تھا - نہ موٹے بھدے تھے اور نہ پتلے دُبے - سینہ چوڑا اور کشادہ تھا - سر بہت بڑا - ڈاڑھی گھنی اور خوبصورت - بڑھاپے تک بہت کم بال سفید ہوئے تھے - موت کو اکثر یاد کیا کرتے اور کہتے کہ جہاں تک انسان کی طاقت ہے میں نے کوئی علم بے حاصل کئے ہوئے نہیں چھوڑا - اب صرف دیدار الہی کی آرزو باقی ہے - وہ بڑے ذہین اور ذکی تھے - پہلے دینی عقائد کی فلسفہ و حکمت کے ذریعے سے تاویل کرتے رہے مگر جب اس بارہ میں قدیم خیال کے علما ان کے مخالف ہو گئے اور ان پر کفر و الحاد کے فتوے چل پڑے تو اس طریقہ کو چھوڑ کر فلسفہ اور حکمت کی وجہتوں کو بکھیرنے میں مصروف ہوئے اور تمام قواعد و مسائل منطق کی کایا پلٹ دی - قدامت کے خیالات کو روکیا اور اپنے زور عقل سے اس کے قواعد کی نئی ترتیب قائم کی +

امام فخر الدین کے دو بیٹے تھے - بڑے کا نام ضیاء الدین اور چھوٹے کا شمس الدین تھا - اگرچہ بڑا بیٹا بھی اچھا عالم تھا - لیکن چھوٹے کی نسبت امام فخر الدین کما کرتے کہ یہ میرا جانشین ہوگا - کیونکہ بچپن ہی سے اس میں لیاقت کے آثار نمایاں تھے +

امام فخر الدین خوارزم میں سخت بیمار ہوئے اور وہاں سے تبدیل آب و ہوا کے لئے ہرات گئے۔ لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اور اپنی حالت خراب ہوتے دیکھ کر انہوں نے ایک شاگرد ابراہیم بن ابی بکر بن علی اصفہانی سے وصیت نامہ لکھوایا۔ مضمون خود بولتے جاتے تھے اور ابراہیم لکھتا جاتا تھا۔ پہلے اپنے عقائد اور پھر تصانیف کا مفصل ذکر لکھوانے کے بعد اخیر میں لکھوایا کہ ان کی موت کا حال پوشیدہ رکھا جائے اور ان کو شرع شریف کے مطابق غسل و کفن دے کر اُس پہاڑ کے دامن میں دفن کیا جائے جو کہ قریۃ مزدخان کے نزدیک واقع ہے۔ لاش قبر میں اُتار کر جس قدر ممکن ہو قرآن مبارک کی ایسی آیتیں تلاوت کی جائیں جن میں خدا تعالیٰ کی قدرت اور عظمت کا بیان ہے اور پھر یہ کہ کمر مٹی ڈال دیں۔ کہ ”اے صاحب کرم پروردگار! یہ تیرا فقیر و محتاج بندہ تیرے حضور میں آیا ہے اس پر رحم و کرم فرما“ یہ بیماری طول کھینچتی گئی اور صحت درست نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ وصیت لکھوانے کے گیارہ ماہ بعد یکم شوال ۷۸۵ھ کو خدا کی طرف سدھار گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

امام فخر الدین کے دو بیٹے اور ایک لڑکی ان کی یادگار تھی۔ بیٹی کی شادی امیر علاء الملک - خوارزم شاہ کے وزیر اعظم کے ساتھ ہوئی تھی۔ خوارزم شاہ کی سلطنت تاتاری فاتح چنگیز خاں کے ہاتھوں برباد ہو چکی تو علاء الملک

اس کے دربار میں داخل ہوا اور مصاحبین کے زمرہ میں شامل۔ جس وقت تاتاری سپاہ کا ایک دستہ شہر ہرات پر بھیجا جانے لگا اُس وقت علاء الملک نے امام فخرالدین کی اولاد کے لئے جو اسی شہر میں تھی چنگیز خاں سے اماں طلب کی اور چنگیز نے اس کی سفارش قبول کر کے اپنے سپہ سالار کو ہدایت کر دی کہ شہر ہرات فتح کرنے کے بعد امام فخرالدین کی اولاد کو کچھ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ بلکہ اُن کو کمال اعزاز و احترام کے ساتھ حاضر دربار کیا جائے۔ چنانچہ تاتاری لشکر شہر ہرات کو فتح کر کے اس میں داخل ہوا تو اُنہوں نے منادی کرا دی کہ امام فخرالدین رازی کی اولاد کو امان دی گئی ہے۔ یہ منادی سن کر شہر کے بہت سے علما۔ مشائخ اور معززین و امرا بخوف جان امام کے عالیشان ایوان میں جا چھپے اور سمجھے کہ یہ مکان دارالامان ہے۔ لیکن وحشی اور خوشخوار تاتاریوں نے امام کے بیٹوں کی زیارت کا بہانہ کر کے انہیں تو اپنی حراست میں لے لیا اور باقی سب آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ پھر امام فخرالدین کے بیٹوں پر کیا گزری اور چنگیز نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ امام فخرالدین رازی کی تصانیف سو جلدوں سے زائد کتابیں اور رسالے مختلف علوم و فنون میں ہیں جن میں ان کی تفسیر مفاتیح الغیب موسوم بہ تفسیر کبیر

۱۲ ضخیم جلدوں میں بیحد مشہور اور مقبول کتاب ہے۔
اور بعض کتابیں فن طب میں بھی بے نظیر لکھی ہیں۔
کیونکہ آپ طبیب بھی تھے +

وفات کے بعد امام فخرالدین کو حسب وصیت
مقام ”مردا خان“ کے دامن کوہ میں دفن کیا گیا۔
اپنے شہر ہرات کے مصافات میں وفات پائی تھی۔
اور جس مقام پر مرغ روح نے اس خاکی پتھر سے
مفارقت کی اس کا نام ”عقابیلہ“ تھا۔ آپ کا زیادہ
تر اپنے وطن شہر رے میں قیام رہا اور جب
بضرورت وہاں سے سفر کیا تو پھر وطن واپس جانے
کی نوبت نہ آئی +



نصیر الدین الطوسی

نام و نسب :- محمد نام - محمد بن حسن کا بیٹا۔
نصیر الدین لقب اور شہر طوس کا رہنے والا تھا۔
بے مثل فیلسوف اور ریاضی داں تھا۔ محقق کا معزز

لہ خراسان سے تیس میل کے فاصلے پر ایک شہر ہے جو ان
دنوں مشہد کہلاتا ہے۔ اس کو بہت سے نامور مسلمان علما
کی جلے ولادت اور ایک امام اہلبیت کا مشہد ہونے کا
شرف حاصل ہے۔ امام غزالی رح بھی اسی شہر میں پیدا
ہوئے تھے + مؤلف

علی خطاب اس کو نصیب ہوا۔ اور ہلاکو خاں "تاری فاتح" کا وزیر و مشیر رہا +

ولادت :- نصیر الدین محمد بن محمد بن حسن کی ولادت ۷۷۵ھ میں بمقام "طوس" ہوئی۔ اس کا آبائی وطن اور مسکن شہر "قم" کے مضافات کی ایسی بستی "جہرود" نامی تھی۔ اس نے غالباً شہر طوس میں پرورش تربیت اور مناسب ابتدائی تعلیم بھی پائی۔ کیونکہ گو قدرت اس کو دنیا میں لحاظ علم و کمال سر آمد علمائے زمانہ بنانے والی تھی لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ پوری تربیت اور ناکارہ ابتدائی تعلیم ایسی سربلک علمی تعمیر کی بنیاد بن سکتی +

اس یگانہ فیلسوف کے ابتدائی حالات اور زمانہ تحصیل علم کے متعلق واقعات پر ایسا تاریکی کا پردہ پڑا ہے کہ ہم کچھ اس کی نسبت یقینی طور سے بیان نہیں کر سکتے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حصول علم اور کسب کمال میں کمال الدین بن یونس موصلی - اور معین الدین سالم بن بدران مصری معتزلی کے حلقہ ہائے درس سے مستفید ہوا تھا۔ اور دو واسطوں سے شیخ الزبیس بوعلی سینا کی شاگردی کا فخر رکھتا تھا +

صاحب کتاب فوات الوفيات لکھتے ہیں کہ "نصیر الدین" اپنے باپ کے بعد منجم تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ غالباً نصیر الدین کا والد محمد بن حسن

نجومی اور اس فن میں صاحب کمال تھا۔ اور یہ ملکہ اس کی اولاد کو بھی وراثہ پہنچا تھا۔ واللہ اعلم ۛ
نصیر الدین طوسی کی عمر کا بڑا حصہ قزستان (کوکستان) کے علاقہ میں گزرا جہاں کہ وہ قرامطہ اور ملاحدہ کے محفوظ مقامات میں رہا کیا۔ اور اخیر میں قرامطہ نے اس کو قید کر لیا تھا۔ لیکن جب تاتاری فاتح ایل خاں نے قرامطہ کے خونخوار قائل اور قابل نفرت گروہ کا بالکل قلع قمع کر دیا اور اس جماعت کا مشہور اور قلب معلعہ "التمونیش" فتح کر لیا۔ نصیر الدین کو وہاں سے رہائی اور تاتاری دربار میں رسائی ملی ۛ

بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ خواجہ نصیر الدین طوسی

۱۰ شہر قزوین کے علاقہ میں ایک مشہور قلعہ تھا۔ یہ قلعہ اپنے نامت مقامات کے ساتھ مل کر "طالقان" کہلاتا تھا۔ بند پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بڑی پیچیدہ گھاٹیوں میں واقع ہونے کے سبب اس کا فتح کرنا غیر ممکن تھا۔ اس کی تعمیر خانمان دلیم کے کسی سلطان نے کی تھی۔ وہ شکاری پرندوں کے ذریعے شکار کھیلتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک شکار پر اپنا باز چھوڑا۔ اور اس کا تعاقب کیا۔ باز نے اسی قلعہ کے مقام پر شکار کو دبوچ لیا۔ اور اس جگہ کی دلکشائی اور محفوظیت دیکھا کہ بادشاہ نے یہاں ایک قلعہ نامعل بنوایا۔ اور اس کو "آتہ موت" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کلمہ دلیم والوں کی خاص بول چال میں شکاری پرندوں کو سدھانے کا لفظ ہے۔ چونکہ لوگ اس جگہ یہی کلمہ کہتے ہوئے پہنچے تھے لہذا اس کا نام بھی یہی رکھ دیا۔ پھر بعد میں کثرت استعمال نے اس کی صورت بدل کر "التمونیش" کر دی ۛ
(مؤلف)

باطنیوں کے ہاتھ میں قید نہ تھے۔ بلکہ اس فرقہ کے فرمانروا اور امام "رکن الدین خورشاہ" کے وزیر و مشیر تھے۔ اور ان کے یہاں پہنچنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ جب ان کی شہرت علوم ریاضیہ میں بہت سمجھ-جو چلی تو انہوں نے دربار خلافت کی سرپرستی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی ایک بیش بہا تصنیف کے دیباچہ میں خلیفہ المستعصم باللہ کا نام درج کیا۔ اور یوں یہ کوشش کی کہ خلیفہ ان کا مرئی بن جائے۔ خلیفہ مستعصم باللہ پہلے تو اس کتاب کے پیش ہونے سے بہت خوش ہوا۔ مگر چونکہ وہ جاہل اور بے عقل تھا۔ اس کے وزیر "ابن العلقمی" نے کتاب دیکھ کر خلیفہ سے کہا کہ اس میں آپ کے نام کے ساتھ "خلیفۃ اللہ علیٰ ارضہ" نہیں لکھا ہے۔ ابن العلقمی اور نصیر الدین طوسی کے باہین سخت عداوت تھی۔ خلیفہ اس کی بات سن کر نہایت برہم ہوا اور اس نے کہا "معلوم ہوتا

رکن الدین خورشاہ۔ باطنیہ گروہ کا آخری اور فوجان امام اور پیشوا تھا۔ اس کی عیش پرستی اور کمزوری ہی سلطنت باطنیہ کی بربادی کا سبب بنی۔ مولف۔ اللہ المستعصم باللہ امیر المومنین عباسی خلفائے بغداد کا آخری خلیفہ تھا جو ہلاکو خان تاتاری کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔ اور اسی وقت سے بغداد کی سلطنت عباسیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ مولف۔ ابن العلقمی ہی وہ وزیر ہے جس نے خاندان خلافت عباسیہ کا قتل ہلاکو خان تاتاری سے پڑھوایا۔ اس کو رنک کی سزا یہ پائی کہ خود بھی قتل کیا گیا۔ مولف

ہے کہ اس کتاب کا مصنف سخت بے عقل ہے۔
 پھر کتاب دریاے وجہ میں ڈلوا دی۔ نصیر الدین طوسی
 خلیفہ کی اس بے اعتنائی پر ناراض ہو کر اس سے
 انتقام لینے کے درپے ہو گیا اور خلیفہ کے ہاتھ سے
 پناہ پانے کے لئے ”التمونت“ کے دربار میں چلا گیا۔
 مگر تجربہ نے اس کو بتایا کہ باطنیوں کا بادشاہ بھی
 اس کی خواہش پوری نہ کر سکیگا۔ اور یہ مقصد اگر حاصل
 ہوگا تو اس زمانہ کے زبردست فاتح بادشاہ ہلاکو خاں
 تاتاری ہی کی سرپرستی سے۔ لہذا اس نے ارادہ کر
 لیا کہ اپنے پناہ دینے والے فرمانرواے ”التمونت“
 سے بھی بے وفائی کرے اور باوجود اس کے کہ
 ”رکن الدین خورشاد“ نے اس کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔
 نصیر الدین طوسی نے اس سے وفا کی اور تاتاری فاتح
 کو التمونٹ کے قلعہ پر قابض بنا دینے کی کوشش
 شروع کر دی۔ جس میں وہ کامیاب ہو گیا *
 گو اس لحاظ سے کہ باطنیوں کی ٹریٹھ سو سالہ
 خونناک حکومت جس کے چھری بند فدائی دنیا پر سخت
 ستم ڈھا رہے۔ اور بنی نوع انسان کے قابل نفرت
 افراد تھے۔ نصیر الدین طوسی کی سعی سے تباہ اور
 غارت ہوئی۔ اس کی اس بے وفائی کو بنگاہ ملامت
 نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن جب ایک اپنے محسن اور
 قدردان پشت و پناہ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی
 طرف نظر ہو تو ضرور کہنا پڑتا ہے کہ خواجہ نصیر الدین

طوسی کا یہ فعل سزاوار ملاست ہے *
 بہر حال نصیر الدین طوسی دربار التتوت کی تنہا ہی
 کے بعد ہلاکو خاں تاتاری کے دربار میں پہنچے اور اسی
 منصب پر مامور ہوئے۔ جو باطنیوں کے بادشاہ کی
 طرف سے ان کو ملا تھا۔ یعنی وزارت کا قلمدان ان
 کے ہاتھ آیا۔ اور ہلاکو نے ان کا رتبہ اس قدر بڑھایا
 کہ کوئی کام ان کا مشورہ لئے بغیر نہیں کرتا تھا۔ بجز
 اس کے کہ مالی معاملات میں ان کو کچھ اختیار نہ دیا تھا۔
 اور سب امور مملکت بالکل انہی کی رائے پر چھوڑ دیے
 تھے۔ نصیر الدین نے ہلاکو خاں کے دل پر اپنا ایسا
 سکہ بٹھا دیا تھا کہ وہ بغیر ان کی اجازت اور مقرر
 کردہ ساعت کے نہ سوار ہوتا اور نہ کسی سفر یا حملہ
 پر روانہ ہوا کرتا *۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو خاں کو علم ہیئت
 کی خدمت پر آمادہ بنا کر شہر مراغہ میں ایک عظیم
 الشان رصد گاہ (جنٹر) بنوایا۔ اور اس کے متعلق
 ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں بغداد
 دمشق اور انجمنیرہ وغیرہ کے اسلامی کتب خانوں کی
 غارت شدہ کتابیں بڑی تلاش اور کوشش کے ساتھ ہم
 پہنچا کر جمع کیں۔ بقول "ابن خلکان" اس کتب خانے
 میں چار لاکھ جلد کتابوں کی فراہم ہوئی تھیں۔ اور اس
 بات سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے *
 جس وقت نصیر الدین نے ہلاکو خاں کو رصد گاہ

بنانے کی طرف رغبت دلائی ہے۔ ہلاکو نے اس سے دریافت کیا۔ ”اس علم نجوم کا نفع کیا ہے کیا اس سے تقدیر کا نوشتہ اور ہونے والی بات پوری نہیں ہو سکتی یا قبل از وقت اس کا دفعہ سوچا جاسکتا ہے؟“ خواجہ طوسی نے عرض کیا۔ ”میں خان اعظم کو مثال کے طور پر ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ آپ حکم دیں کہ ایک شخص ایوان شاہی پر چڑھ کر وہاں سے ایک بڑا سا تانبے کا طشت نیچے پھینک دے۔ مگر اس کارروائی کا علم کسی اور کو نہ ہونے پائے۔“ ہلاکو نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ طشت کے گرنے کی آواز اس قدر ہولناک تھی کہ ایوان کے رہنے والوں میں سے ہتیرے آدمی ڈر کر چیخ اٹھے اور چونک پڑنا تو ایک عام بات تھی۔ لیکن ہلاکو اور خواجہ طوسی کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ ہوئی۔ خواجہ طوسی نے یہ امر ہلاکو کے پیش نظر لا کر اسے سمجھایا کہ بس علم نجوم کا بھی یہی فائدہ ہے کہ نجومی کو واقعات و حادثات آئندہ کا علم ہو جاتا ہے اور وہ ان کے یکایک پیش آنے پر پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا کرتا۔ مگر جن لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا وہ اچانک کسی حادثہ کے وقوع سے ڈر جاتے اور پریشانی کے شکار بنتے ہیں۔ ہلاکو نے یہ دلیل سن کر حکم دیا کہ اچھا رصدگاہ تعمیر ہو۔ میں اس کے بنانے میں اب کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا +

اسی طرح نصیر الدین طوسی کی خوش فکری اور تدبیر کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہلاکو خاں اپنے دفتر دار علاء الدین الجومینی پر ناراض ہوا اور اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ علاء الدین کا بھائی خواجہ نصیر الدین کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ آپ کچھ تدبیر کریں تاکہ میرا بھائی جان سے نہ مارا جائے۔ خواجہ کو معلوم تھا کہ ہلاکو اپنے حکم کو کبھی منسوخ نہیں کرتا۔ خصوصاً جبکہ دربار میں حکم دے کر کہیں باہر جانے کے لئے سوار ہو جائے پھر اس کا فرمان قضاے منہرم ہو جاتا ہے۔ دل میں غور کیا کہ کوئی حیلہ کرنا چاہئے۔ فوراً عصا اور تسبیح سنبھال کر اصطراب ہاتھ میں لے لیا۔ اور ایک غلام کو ہدایت کی کہ انگلیٹھی میں بخور سلگاتا ہوا اس کے ساتھ آئے۔ اسی صورت سے خان کے سراپردہ تک گیا۔ غلامان خاص جو سراپردہ کے گرد حراست پر مامور تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ خواجہ صاحب اس طرح تشریف لا رہے ہیں۔ اور خواجہ نے اُن کو دیکھ کر غلام سے زیادہ بخور ڈالنے کی فرمائش کی اور خود بار بار اصطراب کو دیکھنا اور منہ بنانا آغاز کر دیا۔ صورت سے فکر کے آثار ہویدا تھے۔ ہلاکو کے غلامان خاص یہ بات مشاہدہ کر کے خان کی خدمت میں گئے اور اسے اطلاع دی کہ خواجہ طوسی اس حالت میں آ رہا ہے۔ خواجہ نے سراپردہ کے قریب

جا کر شاہی خواص سے استفسار کیا کہ ”خان“ کہاں ہے؟

غلاموں نے جواب دیا۔ ”سراپردہ میں“ +
خواجہ۔ ”اچھے تو ہیں! کوئی تکلیف تو نہیں۔ صحت
کیسی ہے؟“

غلامان خاص۔ ”بالکل بخیریت اور خوش ہیں“ +
یہ سن کر خواجہ نے سجدہ شکریہ کیا اور اس کے بعد
غلاموں سے پھر دریافت کیا۔ ”ہاں۔ کیا خان ہر طرح
بخیریت اور خوش ہیں؟“

غلاموں نے کہا کہ ”ہاں“ اور یہ جواب سن کر
دو بارہ اور سہ بارہ اُن سے وہی پہلا سوال کیا۔
جس کے بعد بہت تردد کے لہجہ میں بولا۔

”میں خان کا دیدار چاہتا ہوں۔ جب تک اپنی
آنکھوں سے اُن کا روئے زیبا نہ دیکھ لوں مجھے
چین نہیں آنے کا“ +

یہ ایسا وقت تھا کہ ہلاکو اس وقت کسی سے
ملا نہیں کرتا تھا۔ مگر غلاموں نے جا کر خواجہ کی
خواہش بیان کی تو اس نے فوراً اس کو بلوا لیا۔
خواجہ سراپردہ کے اندر داخل ہوا۔ اور ہلاکو کے
سامنے تسلیم کے لئے جھک گیا۔ اور دیر تک سر
خم کئے رہا۔ ہلاکو نے دریافت کیا۔

”کیوں خواجہ! خیر تو ہے۔ اس وقت آنے کی کیا
وجہ ہے؟“

خواجہؒ خان اعظم ! اس وقت طالع کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کے دشمنوں پر کوئی بید سخت آفت نازل ہونے والی ہے۔ پس نمکخوار سے نہ رہا گیا۔ فوراً اٹھا۔ اور جو دعائیں اور بخورات اس طالع کی نحوست سے بچنے کے لئے مؤثر ہو سکتے ان کو پڑھتا اور سلگاتا ہوا بارگاہ عالی کی طرف دوڑا۔ اور میری دعا ہے کہ خداے پاک حضور کو چشم زخم زانہ سے محفوظ رکھے۔ خان اعظم اسی وقت یہ حکم صادر فرمائیں کہ قلمرو شاہی میں جتنے گنہگار اور قابلِ دارِ خطا وار ہیں سب کی جان بخشی ہو۔ اور قیدیوں کو زندان سے آزاد کیا جائے۔ ممکن ہے کہ خداوند کریم اپنا فضل خان کے شریکِ حال کرے۔ اور آئی بلا کو ٹال دے۔ اگر میں حضور کا چہرہ مبارک اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے یہ یقین نہ حاصل کر چکا ہوتا کہ جناب ہر طرح بخیریت اور خوش ہیں تو اس میں شک نہ تھا کہ نمکخوار کی حالت فکر و تردد سے غیر ہو گئی ہوتی۔ آفت ! اب سچھے اطمینان ہوا ہے۔

چنانچہ ہلاکو سے اپنے سامنے عام معافی کا فرمان صادر کرا کے اور اس پر بہت کچھ دعائیں پھونک کے واپس آیا۔ اور یوں تمام گرفتارانِ بلا کے ساتھ علاء الدین کو موت کے چنگل سے رہائی مل گئی۔ خواجہؒ نے اس کارنامہ کا اس سے کبھی ذکر تک نہیں کیا اور نہ اس پر کوئی احسان لکھا۔

ایک بار ایک باتصویر کتاب "ترباق فاروقی" کے ذکر میں ہلاکو کے سامنے پیش کر کے ترباق مذکور کی تعریف میں ایسی موثر تقریر کی اور اس کے فوائد اتنی خوبی سے بیان کئے کہ ہلاکو نے اُسے ترباق مزبور تیار کرنے کی اجازت دے دی اور صرف تین ہزار اشرفیاں سنہرا ہاون دستہ بنوانے کی غرض سے عطا کیں تاکہ اس میں اس دوا کے اجزا کوٹے جائیں۔ ہلاکو نے خواجہ نصیر الدین کو اپنے قلمرو کے تمام اوقاف کا نگراں اور اعلیٰ افسر مقرر کر دیا تھا۔ نصیر الدین نے اس صیئہ کو بڑی خوبی سے باقاعدہ محکمہ بنایا۔ ہر ضلع اور صوبہ میں اپنے ماتحت افسر مامور کئے اور اوقاف کی آمدنی باقاعدہ وصول کر کے اسی سے رصد خانہ کے ملازمین اور منتظمین کی تنخواہیں رصد کے کاموں کے مصارف۔ مسلمانوں کے مفید کام۔ اور سادات علوی۔ اہل تشیع۔ اور حکما وغیرہ کے وظائف ادا کیا کرتا۔ وہ مسلمانوں سے عموماً۔ اور شیعہ فرقہ سے خصوصاً بڑی ہمدردی کیا کرتا۔ اسلامی اوقاف کی حفاظت اور سادات کی خدمت میں فراخ دلی سے حصہ لیتا تھا۔

رصد گاہ کا انتظام خواجہ نصیر الدین نے اپنے فرزند کلاں "علی" کے سپرد کر رکھا تھا۔ یہ نوجوان علم نجوم میں ماہر کامل تھا۔ اس کے ماتحت رصد گاہ کی ترتیب اور اس کے آلات کی درستی اور رصد کو اکب کے کام

پر چار حسب ذیل نامور علما مامور تھے :-

(۱) شمس الدین بن المؤید العرضی +

(۲) شمس الدین الشردانی +

(۳) شیخ کمال الدین الایکی +

(۴) حمام الدین الشامی +

آلات رصد کی افراط تھی۔ کچھ حلقہ نما آلات تھے۔

جن کی تفصیل یہ ہے :- پانچ تائبے کے بنے ہوئے

دائرے۔ ان میں سے پہلا دائرہ نصف النہار کا تھا۔

اور یہ زمین پر گڑا ہوا تھا۔ دوسرا دائرہ معدل النہار

تیسرا دائرہ منطقة البروج۔ چوتھا دائرۃ العرض۔ پانچواں

دائرۃ المیل +

اور ان کے علاوہ ایک شمسی دائرہ بھی تھا جس

سے کواکب کی سمت پہچانی جاتی تھی +

اس رصد گاہ کی تعمیر کے لئے اور اس کے

ملازمین کے وظائف اور ان کی تنخواہوں کے واسطے

خواجہ نصیر الدین نے ہلاکو خاں سے جس قدر مال لیا

اس کا صحیح اندازہ تو خدا ہی کو معلوم ہوگا۔ لیکن

تخمیناً وہ ایک بھاری رقم تھی۔ اور اس زمانہ میں

ہلاکو خاں کے سوا کوئی اتنی کثیر رقم اس کام کے

لئے دے نہیں سکتا تھا +

خواجہ نصیر الدین اپنی کتاب ”زیج ایلبانی“ میں

لکھتا ہے :- ”میں نے رصد گاہ کی تعمیر کے واسطے

حکماء کی ایک جماعت بہم پہنچائی۔ دشتق کا باشندہ

”المؤید العرضی“ - مراغہ کا رہنے والا فخر الدین جو کہ موصل میں رہتا تھا - تفلیس کا رہنے والا - فخر الدین الخلاصی - اور قزوین کا ساکن النجم دبیران - یہ چار فاضل اور یکتائے فن حکما اس کے مددگار تھے - یہ رصد گاہ بمقام ”مراغہ“ ۷۵۰ھ میں بننا شروع ہوئی تھی - اس سے قبل دُنیا میں حسب ذیل رصد گاہیں اور موجود تھیں :-

رصد گاہ کے بانی کا نام	اس کی تعمیر کی مدت رصد ایجابی کی تعمیر سے قبل -
(۱) رصد برجیں	۱۴۰۰ سال کی سب سے قدیم رصد گاہ ہے -
(۲) رصد بطلمیوس	اس کے بعد کی تعمیر ہے -
(۳) رصد مامون الرشید اعظم	اسلامی عہد کی رصد گاہیں
(۴) رصد بنیانی حدود شام میں	بغداد میں مدت تعمیر ۴۳۰ سال
(۵) رصد حاکی مصر میں	
(۶) رصد بنی الا علم بغداد میں	۲۵۰ سال

استادان فن کا قول ہے کہ سب سے سیارہ کی رصد کا پورا ہونا کم از کم تیس سال کے عرصے میں ممکن ہے - کیونکہ دورہ کواکب سب سے اتنے ہی عرصے میں کامل ہو پاتا ہے - مگر ہلاکو نے خواجہ نصیر الدین کو حکم دیا کہ وہ ساتوں سیاروں کی رصد صرف بارہ سال کے زمانہ میں پوری کرنے کی کوشش عمل میں لائے -

نصیر الدین نے وعدہ کیا کہ وہ اس فرمان کی تعمیل کریگا۔

اخلاق و عادات :- کے لحاظ سے نصیر الدین

طوسی ایک نہایت نیک دل - متحل مزاج - سخی - صاحب کرم - بلند - فیاض اور خوش خلق تھا - خداوند کریم نے حُسنِ سیرت کے ساتھ ہی اس کو حُسنِ صورت اور وجاہت ظاہری کے زیور سے بھی آراستہ بنایا تھا - وہ احسان کرتا اور کسی پر احسان نہ دھرتا - خلقِ خدا کی خدمت کو اپنی سعادت خیال کرتا تھا - اور ہمیشہ سب سے اچھا برتاؤ کرنے

میں کوشاں رہتا۔ ایک بار کسی شخص نے خواجہ نصیر الدین کو رقعہ لکھا اور اس میں اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ منجملہ اور سخت فقروں کے جو اس رقعہ میں لکھے تھے - ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ”اے کُتے اور کُتے کے بچے“ خواجہ نے اس رقعہ کا جواب یہ لکھا :-

”آپ کا یہ کہنا کہ ”تو ایسا ہے“ صحیح نہیں ہے - کُتا چار پایہ ہے وہ بھونکتا ہے - اور اس کے ناخن لمبے اور نوک دار ہیں - لیکن میں سیدھے قد والا - صاف جلد والا جس کے چہرے پر بال اور رومی نہیں ہیں - چوڑے ناخنوں والا - ناطق اور ضاحک ہوں اور یہ فصول و خواص اُن فصولوں اور خاصوں کے برخلاف ہیں جو کُتے میں پائے

جاتے ہیں۔

غرض کہ یوں ہی۔ تین دلائل کے ساتھ تمام اعتراضات کا جواب دیا اور تردید کی۔ ذرا بھی ناراضی جواب میں ظاہر نہ کی۔ اور نہ کوئی جبراً کلمہ تحریر کیا ممکن ہے کہ اس بات کو معمولی خیال کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ معمولی امر نہیں۔ بلکہ نہایت قابل قدر بات ہے۔ طبیعت پر اتنا قابو پانا اور یوں اس کو غیظ و غضب سے روکنا بڑے شیر مرد حکما کا کام ہے۔

علمی کارنامے :- خواجہ نصیر الدین طوسی کے علمی کارنامے بہت سے ہیں۔ سب سے عظیم الشان کام تو یہی رصد گاہ مقلی جس کا اوپر ذکر ہو چکا۔ اس کے علاوہ اس کی اعلیٰ درجے کی تصنیفات ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) "المشوسطات" ہندسہ و ہیئت میں بے مثل کتاب

ہے۔
(۲) امام فخر الدین رازی کی کتاب المحصل کا اختصار۔ اس میں خواجہ طوسی نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کیا ہے اور اس کی ترتیب کو فضول زوائد سے پاک بنایا ہے۔

(۳) شرح اشارات۔ مصنفہ شیخ الرئیس ابن سینا۔ اس شرح میں خواجہ طوسی نے امام فخر الدین رازی کی شرح کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام

فخر الدین نے اشارات کی شرح نہیں لکھی بلکہ اس پر جرح کی ہے۔ محقق طوسی نے یہ شرح پورے بیس سال کے زمانہ میں لکھی۔ اور امام رازی کے اعتراضات کو دفع کر کے ان پر اپنی جانب سے بہت کچھ اعتراضات جرّے۔ کیونکہ امام رازی نے شیخ الرئیس کی مٹی جُری طح پلید کی تھی۔ محقق طوسی نے حق شاگردی ادا کیا اور امام رازی کی خبر لی۔ مگر ان دونو کے اعتراضات اور اقوال پر بعد میں قطب الدین شیرازی نے محاکمات لکھے اور اس میں جانبین کی زیادتیاں دکھا کر مناسب دلائل کو تسلیم اور باقی کو رد کیا۔

(۴) تجرید۔ یہ منطق کی اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے۔
 (۵) اوصاف الاشراف (۶) قواعد العقاید (۷) التخلیص۔
 علم کلام میں (۸) غروض پر ایک کتاب فارسی زبان میں۔

(۹) بطلمیوس کی کتاب مجسطی کی شرح۔
 (۱۰) جامع الحساب۔ اس میں اسطرلاب اور کرہ ارضیہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔ اور علم ہیئت اور ہندسہ کے متعلق قیمتی اور مفید معلومات جمع کر دیے ہیں۔

قطب الدین شیرازی بہت بڑا علامہ وقت اور منطقی و فیلسوف گزرا ہے۔ یہ محقق طوسی کا شاگرد بھی تھا۔ تنہا ہی بغداد کے بعد وہاں کی جو کتابیں محقق طوسی نے جمع کی تھیں ان کی ترتیب اور فہرست بنانے کا کام اسی کو سپرد کیا گیا۔

اس فن میں محقق طوسی کا پایہ بہت بلند تھا *
 (۱۱) کتاب الفرائض حسب مذہب اہلبیت (۱۲) تعدیل
 المعیار (۱۳) بقاء النفس - اس میں ثابت کیا ہے کہ
 بدن کی ہلاکت کے بعد بھی نفس یعنی روح باقی رہتی
 ہے - (۱۴) جبر و مقابلہ - (۱۵) اثبات عقل فعال -
 (۱۶) رسالہ اثبات واجب الوجود - (۱۷) رسالہ امامت -
 (۱۸) کلیات قانون شیخ پر حواشی - (۱۹) زیج الیجابی -
 (۲۰) رسالہ معرفۃ التقویم - تیس نصلوں میں *
 (۲۱) اخلاق ناصری - علم اخلاق و آداب نفس میں جو
 فن حکمت کی ایک اہم شاخ ہے - یہ کتاب زبان
 فارسی میں ہے - خواجہ طوسی نے اس کو علاقہ
 ہستان میں تالیف کیا تھا - وہ اس کتاب کے دیباچہ
 میں اعتراف کرتا ہے کہ یہ کتاب علامہ احمد بن
 مسکویہ کی کتاب ”تہذیب الاخلاق“ کا ترجمہ ہے -
 اور اس میں وہ اپنی طرف سے صرف دو باب
 سیاست بدن - اور سیاست منزل کے اضافہ کرتا
 ہے - لیکن اس اضافہ سے کتاب نہایت مفید
 اور کارآمد ہو گئی ہے *

ان کے علاوہ چند اور تصانیف بھی ہیں -
 جن کے ذکر کی یہاں حاجت نہیں پائی جاتی *
 محقق طوسی کی نسبت لوگوں کا یہ خیال بھی
 ہے کہ اس نے تاتاری دربار میں پہنچ کر خلیفہ
 بغداد سے اس کی بد سلوکی اور نا قدردانی کا

انتقام لینا چاہا اور ہلاکوں کو بغداد پر حملہ کرنے کے لئے ابھارا۔ ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ لیکن ہم کو اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملا ہے۔
اسی طرح ایک غلط روایت خواجہ طوسی کی نسبت یہ مشہور ہے کہ اس نے علامہ ابن الحاجب مصنف کافیہ وشافیہ سے کچھ بے اعتنائی کی تھی۔ مگر تاریخ اس کا معتبر ہونا ظاہر نہیں کرتی۔ اس لئے غالباً یہ غلط افواہ ہے کیونکہ ابن الحاجب اس کے رسوخ پانے سے قبل ہی فوت ہو چکا تھا۔

خواجہ نصیر الدین طوسی ۷۵ سال ۷ ماہ اور ۷ یوم زندگی کی منزلیں طے کر کے ماہ ذی الحجہ ۷۵۷ھ مطابق ۷۷۷ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا۔ اور اسے حسب وصیت حضرت امام کاظمؑ کے مزار مبارک کے نزدیک دفن کیا گیا۔ وہ چند ماہ سے بغداد میں آ گیا تھا۔ شاگردوں اور حشم و خدم کا گروہ کثیر اس کے ساتھ تھا۔ یہیں مرض الموت لاحق ہوا۔ اور آخر کار دُنیا سے چل بسا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا گیا۔ حاکم بغداد اور تمام امرا اور معززین نے شایعت کی تھی۔ ایسے زبردست فیلسوف و عالم کی وفات کا عام صدمہ دلوں کو بے چین بنائے تھا۔
خواجہ طوسی نے تین فرزند نرینہ اپنی یادگار چھوڑے۔

(۱) صدر الدین علی - یہ باپ کے بعد اس کے مناصب پر مامور ہوا اور عرت کی زندگی بسر کر کے فوت ہو گیا ۔

(۲) اصیل حسن - اپنے بھائی صدر الدین علی کے بعد اس کی جگہ پر مقرر ہوا مگر بد دیانتی کی وجہ سے آخر کار معزول اور ذلیل ہوا ۔

(۳) فخر احمد - یہ ظلم و بد دیانتی کے جرم میں قتل کیا گیا ۔

ابو الفیض فیضی

نام و نسب :- ابو الفیض - فیضی فیاضی - نام و تخلص - شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری کا فرزند ہے - اس کے دادا شیخ خضر کے جد امجد شیخ موسیٰ ملک "مین" (عرب) سے جو اصلی وطن تھا - اولیٰ ہند کی ملاقات کے لئے نکلے تھے اور نویں صدی ہجری میں علاقہ سندھ کے قصبہ "ریل" کو اپنی گوشہ نشینی کے لئے انتخاب کیا اور سکونت کی جگہ بنا لیا - اور وہیں بزرگ خدا پرستوں کے یہاں شادی کر لی بیٹے پوتے بھی اپنے بزرگ مورث کی طرح آئین درویشی کے پابند رہے - شیخ خضر کو دسویں صدی کے شروع میں اصلی وطن عرب کی یاد آئی - وہ چلے کر چل کر عزیزوں کو دیکھیں - بہت سے

لے سیرستان میں ایک دکنش آبادی ہے + مولن

رشتہ داروں اور دوستوں کو رفاقت میں لے کر ہندوستان میں آئے۔ ناگور پہنچے تھے کہ کئی بزرگوں کے ایما سے یہاں سکونت اختیار کر لی۔ لوگوں کو ہدایت کرنا شروع کیا۔ ۹۱۱ھ میں اسی جگہ (یعنی ناگور میں) شیخ ”مبارک“ پیدا ہوئے۔ باپ نے ”مبارک اللہ“ نام رکھا۔

شیخ مبارک ۱۲ برس کے سن میں رسمی علوم سے فارغ ہو گئے تھے۔ پھر سیاحت اختیار کی۔ اور علم و فضل کے شوق میں بڑے بڑے بزرگوں کی خدمت میں پہنچے۔ ناگور میں شیخ ”عطن“ سے کسب کمال ظاہر و باطن کرتے رہے۔ پھر خواجہ عبداللہ احرار سے فیض علم پایا۔ خطیب ابو الفضل گازرونی سے دوران سیاحت میں علوم منطق و حکمت و فلسفہ میں کامل استفادہ کیا۔ غرض کہ بے مثل فیلسوف نہایت زبردست عالم۔ بجد متقی اور دیندار بزرگ ہوئے۔ لیکن قسمت کے ہیٹے تھے۔ صفائی باطن اور تقویٰ و طہارت کی پابندی کے سبب ہم عصر علما کے محسود رہے۔ اور ان کی سازشوں کے باعث مصائب میں مبتلا۔ کبھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ کسی دربار میں رسائی نہ مل سکی اور ملی تو حاسدوں نے کاٹ پھانس کر کے جبنے نہ دیا۔ ۹۱۶ھ میں بمقام آگرہ توطن اختیار کیا۔ شیخ علاؤ الدین مجذوب کی ہدایت لے اجیر کے شمال و مغرب میں ایک آباد جگہ ہے۔ سرف

سے یہاں رہ پڑے تھے۔ دریائے جہنا کے اس پار ”چار باغ“ نامی بستی میں مقیم ہوئے اور ایک سادات کے اچھے خاندان میں شادی کر لی۔ درس و تدریس کا ظاہری بشفلہ تھا۔ اور خلوت میں اذکار و اوراد کا شغل۔ گزر اوقات کی صورت یہ تھی کہ کوئی محتاط مخلص کچھ نذر لاتا تو ضرورت کے موافق لے لیتے تھے۔

ولادت تربیت اور تعلیم: ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۷ء میں بمقام ”چار باغ“ واقع آگرہ شیخ مبارک کے درخت آمید میں پہلا پھل لگا۔ یعنی ”ابوالفیض“ ماں کے شکم سے اس کی آغوش میں آیا۔ اگرچہ سعادت و اقبال اس کا دامن تھامنے کو تھے۔ لیکن وہ وقت دور تھا۔ ابھی تو ماں باپ کی سراپا افلاس زندگی اور پریشانیوں سے گھری ہوئی حالت تھی۔ نہ رہنے کا آرام تھا اور نہ کسبی قسم کے ناز و نعمت کا سامان۔ تنگدستی اور فاقہ مستی سے سابقہ تھا۔ مگر فاعل اور علامہ زمانہ باپ کی تربیت و تعلیم کی کود میں پلا اور پروان چڑھا۔ علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ تو ذہن و ذکا۔ فہم رسا۔ اور دل و دلیخ حقیقت آشنا خدائے پاک کے یہاں سے ساتھ لایا تھا۔ ایشیا میں اس وقت جتنے علم عقلی اور نقلی رائج اور پڑھے پڑھائے جاتے تھے ان

لے پہلے اس کا نام چار باغ تھا۔ پھر بہشت کہلایا۔ بابر بادشاہ نے نئی طرح بنا کر نور انشاں نام رکھا۔ اور اب ”رام باغ“ کے نام سے موسوم ہے۔ مولف

سب میں مہارت حاصل کی۔ فلسفہ و حکمت میں خاص طور سے جوہر طبیعت دکھائے۔ مگر شعر و سخن کا مذاق غالب تھا۔ اس فن میں فیضی نے جو کمال دکھایا۔ وہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ اس کا دل اور دماغ قدرت کے فیضان سے سیراب تھا۔ اور ”ملک الشعراء“ اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا۔ لیکن ہمہ واں فاضل اور یکساں وقت عالم تھا۔ نور چشم کا کلام دیکھا کرتا اور اس کو فن شعر کی باریکیوں سے مطلع بناتا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا۔ اور اس سے سخن کے رموز کا سرچشمہ کھولتا تھا۔ ابو الفیض نے فن طب بھی حاصل کیا تھا۔ لیکن اس سے فائدہ فقط اسی قدر اٹھایا کہ خدا کے بندوں کا علاج کر دیتا۔ کسی سے اجرت یا نذرانہ کچھ نہیں لیا کرتا تھا۔ بلکہ جب مفلسی کی آفت سے رہائی اور ناتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے ہی پاس سے دینے لگا۔ اور جس وقت خدا کے فضل سے دولت و حشمت پائی اور خود فرصت علاج سے محروم ہو گیا تو خلق خدا کی آرام رسائی کے لئے اپنے خرچ سے ایک شفا خانہ بنوا دیا +

شیخ مبارک اور اس کے فاضل بیٹوں کے حالات خدا کی قدرتوں کے کبیل ہیں۔ ان کو دشمنوں نے بیس سال تک ناگوں چنے چوائے رکھا۔ ایک دم چین نہ لینے دیا۔ گھر اجڑا دیا۔ گرفتار کر لیا۔ در بدر پھرایا۔

غرضکہ وہ کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کی نیت
جان بھی لینے کی تھی۔ لیکن سائیں کے وٹے ہوئے
جیو کو اسی کے سوا کوئی لے نہیں سکتا۔ مصیبت کی
کھن گھڑیاں تو کٹ گئیں۔ جان بچی۔ جان پایا۔ آخر کار
ایک دن سب مشکلیں بھیل کر ”اکبر بادشاہ“ کی معدلت
گستری کے سبب پھر وطن میں آئے اور اُجڑا گھر آباد
کیا۔ شیخ مبارک اپنے لٹے ہوئے گھر اور آجڑی اور
گڑی ہوئی مسجد میں آکر بیٹھا۔ درس و تدریس
کا سلسلہ چلا اور وعظ و ہدایت کی مجلسیں گرم ہونے
لگیں۔ بادشاہ کی نگاہ زمانہ کے فاضل اور کامل لوگوں
کی تلاش میں تھی۔ جہاں باعمل اور مدبر عالم ہوتے
اور دربار میں اُن کا شہرہ پہنچتا۔ دربار میں بلائے
اور معزز مرتبوں پر سرفراز کئے جاتے۔ شیخ مبارک
کا کمال بھی پرواز کے پر کھول اور گندے تول تول
کر رہ جاتا تھا۔ اس کی فحیرت و حمیت اور اس کا
بے نیاز دل امرا کے دروازوں کی گدائی پسند نہ کرتا
تھا۔ اس لئے اس فیض عام سے محروم تھا۔
دربار میں رسائی۔ مصاحبت اور عزت کا
حصول :- شیخ ابوالفیض فیضی ۱۹ سال تک آئے دن
کی مصیبتوں کے سبب دم لینے کی فرصت نہیں پاسکا
تھا۔ اور روز روز کے صدیوں نے اس کا قانیہ تنگ
کر رکھا تھا۔ اب خطروں اور پریشانیوں سے چھوٹ
کر آرام کے ساتھ گھر میں بیٹھا۔ تو اُس کی طبیعت بھی

کھلنے لگی اور اس کی طبیعت کی شاخ سے جو پھول
 بھڑتے تھے اُن کی مہک میدانِ عالم میں پھیل کر دربارِ
 تک بھی جا پہنچی۔ ۱۲۹۹ھ میں شہنشاہِ اکبر کی فوج
 ”چتوڑ“ پر چڑھی تو کسی موقع سے فیضی کا بھی دربار
 میں ذکر آ گیا۔ شہنشاہِ کمال کا جوہری تھا۔ جواہر کے
 شوق نے دل بیقرار کر دیا۔ فوراً طلبی کا حکم صادر
 کیا۔ دشمن بھی لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سُن
 طلب کو عتاب آمیز طلبی کے پیراہ میں ظاہر کیا۔
 اور آگرہ کے حاکم کو لکھا کہ ”فوراً گھر سے بلا کر سواروں
 کے ساتھ روانہ کر دو“۔

شاہی حکم نامہ آگرہ کے حاکم کو ملا۔ تھوڑی سی رات
 گئی ہوگی۔ چند ترک سپاہی شیخ کے گھر پہنچے اور غل
 مچایا۔ اُن کو کیا معلوم تھا کہ بادشاہِ سلامت کے شوق
 کا سکہ ستہ لینے آئے ہیں۔ یا مجرم کو پکڑنے۔ حاسدوں
 نے ان کو سمجھا دیا تھا کہ شیخ بیٹے کو چھپائیگا۔ چلے
 حوالے کریگا۔ اتفاق سے فیضی اس وقت باغ کی سیر
 کو گیا تھا۔ دشمن چاہتے تھے کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے۔
 اور شیخ کو پریشانی نصیب ہو۔ شیخ نے سپاہیوں سے
 بے تکلف کہہ دیا کہ ”فیضی گھر میں نہیں“ بے سلیقہ
 سادہ لوح سپاہی جن کو یاروں نے پہلے ہی بھر دیا تھا
 اُٹنے لگے۔ قریب تھا کہ آفت لائیں۔ مگر اتنے میں
 خدا کا کرنا فیضی بھی باہر سے آ ہی گیا۔ اور بات
 رفع دفع ہو گئی۔ لیکن اب سفر کا سامان کٹھن کام تھا۔

مغلی کا پردہ شاگردوں اور سچے دوستوں نے ڈھانکا۔
یہ مشکل حل ہوئی۔ اور فیضی رات ہی کو گھر سے روانہ
ہو گئے۔ مگر اس طرح کہ گھر والے دُبدھے اور غم میں
پڑ گئے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن بعد مژدہ
بلا کہ جہاں پناہ نے غریب نوازی فرمائی ہے کوئی خون
کی جگہ نہیں +

فیضی بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے۔ جہاں
عالم پناہ جلوس فرماتے اُس بارگاہ کے گرد جالی کا
کھڑا لگا تھا۔ ان کو باہر کھڑا کیا گیا۔ فیضی سمجھے کہ
اس طرح کلام سننے میں خاک بھی مزہ نہ آئیگا۔ فوراً
یہ قطعہ پڑھا :- قطعہ

بادشاہ! درونِ پنجرہ ام از سرِ لطفِ خود مرا جاوہ
زانکہ من طوطیِ شکرِ خایم جاے طوطیِ درونِ پنجرہ بہ
شہنشاہِ اکبر نے اس حاضر کلامی سے محفوظ ہو کر
جالی کے اندر اور اپنے پاس بلا لیا۔ اور فیضی نے
اول دربار میں اپنا وہ قصیدہ پڑھا۔ جس کا مطلع
یہ ہے :-

سحر نوید رساں قاصدِ سلیمانی

رسید ہیچو سعادت کشادہ پیشانی

قصیدہ میں ۱۹۷ شعر ہیں۔ ہر شعر سے کمال شاعری
کے علاوہ فضیلتِ علم اور فلسفہ حکمت کے فتواری
جاری ہیں۔ چونکہ دربار میں آئے ہوئے راستہ ہی میں
موزوں کیا ہے۔ اور موقعِ وقت سامنے ہے۔ اس

لئے اکثر مناسب حال مضامین بچہ خوبی سے ادا ہوئے ہیں +

بلند خیال شاعر فیضی ایک خوش مزاج عالم اور شگفتہ بیان شخص تھا۔ خدا داد عقل و دانش اور وسعت علم و فضل کی بدولت چند ہی دن میں بادشاہی مصاحب ہو گیا۔ اور بادشاہ کو اس کے ساتھ وہ الفت ہوئی کہ سفر اور حضر کہیں ہو فیضی کے بغیر دل ہی نہ لگتا تھا۔ فیضی نے اپنا نقش اعتبار بادشاہ کے دل پر جما دیا۔ اور تھوڑے عرصے بعد اپنے علامہ زمان بھائی "ابو الفضل" کو بھی دربار میں بلوا لیا۔ اب تو یہ عالم ہو گیا کہ سلطنت کے بڑے چھوٹے ہر قسم کے کام ان دونو بھائیوں کی صلاح سے ہونے لگے۔ جو ان کی رائے ہوتی وہی بادشاہ جہاں پناہ کی بھی مرضی ہوا کرتی۔ فیضی نے شاعری کی وجہ سے کوئی ملکی اور مالی خدمت اپنے ہاتھ میں نہیں لی۔ مگر تمام معاملات اس کی صلاح پر منحصر رہتے تھے +

ملکی و مالی خدمات :- جس وقت فیضی کو دربار اکبری میں دخل ملا ہے اُس وقت تک ہندوستان کے بادشاہی دفتر میں کافذات کی تحریر کا ڈھنگ نہ رہا تھا۔ ہندو ملازم ہندی اصول پر۔ اور ولایتی اپنے طریقے پر لکھا کرتے تھے۔ اس سے دفاتر شاہی میں عجب خلط ملط ہو رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے ٹوڈرل۔ فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی۔ حکیم ابوالفتح

اور حکیم ہمام نے باہمی مشورہ سے دفتر کے کاغذوں کی ترتیب و تحریر کے قواعد تیار کئے۔ اور حساب کا سیاق بھی مقرر ہوا۔ تاکہ سب محاسب ایک ہی طریقہ پر عمل کر سکیں اور تحریروں میں اختلاف باقی نہ رہے۔ جو شاہزادہ پڑھنے کے قابل ہوتا۔ اس کی استادی کا اعزاز بادشاہ کی طرف سے فیضی ہی کو مرحمت ہوا کرتا۔ فیضی ان کا اتالیق مقرر کیا جاتا۔ سلیم۔ دانیال اور مراد سب اسی کی تربیت کے فیض یافتہ تھے۔ ۹۹۶ھ میں دربار شاہی سے ”ملک الشعراء“ کا خطاب ملا۔ چغتائی مغل خاندان کے بادشاہوں میں سب سے پہلے یہ خطاب ”غزالی شہیدی“ کو ملا تھا۔ اور بعد ازاں فیضی کو حاصل ہوا۔ فیضی نے اس کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ وہ بڑا قانع مزاج تھا۔ اس نے کبھی کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہیں کی۔ اور اتفاق وقت یہ کہ ملک الشعراء کا خطاب سننے سے دو ہی تین دن پہلے مبداء فیاض نے اس سے ایک قصیدہ کے مطلع میں اس کی پیشینگوئی بھی کرا دی تھی۔ کہتا ہے : ۵

آں روز کہ فیض عام کردند ما را ملک الکلام کردند
اکبر فیضی کو ”شیخ جیو“ (شیخ جی) کہا کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فیضی اور فضل دونو بھائی اکبر کا نفس ناطقہ تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ ان کا سا خلوص اور ان کی جیسی وفا شعاری اور مخدوم پرستی

بھی کسی میں ہونا کارے دارو۔ اہل دکن جو مغلیہ حکومت سے ہمیشہ سرکش رہے۔ اُن کو اپنے زیر اثر بنانے کی خدمت اکبر نے فیضی ہی کو سپرد کی تھی۔ جسے فیضی نے کمال لیاقت و دانائی کے ساتھ انجام دیا۔ راجی علی خاں حاکم ”خاندیس“ کو شہنشاہ اکبر کا پکا ارادتمند بنایا۔ اور اس طرح ملک دکن کی کنجی اس کے قبضہ میں دے دی۔ فیضی ایک سال ۸ ماہ اور ۱۴ دن میں یہ خدمت بجا لا کر دربار میں واپس آیا۔ یہ سلسلہ کا زمانہ تھا۔ اور یہاں آ کر پھر وہی مصاحبت اور دربار داریاں ہونے لگیں۔ شاعری پھول برساتی تھی۔ غور تصنیف کان سے جواہر نکالتی تھی۔ لیکن اس سفر سے آ کر طبیعت کا رنگ کچھ اور ہو گیا تھا۔ اکثر خاموشی رہتی اور کسی غور میں پڑا نظر آتا۔ اسی عالم میں بادشاہ کی فرمائش سے ”خمسہ“ پر پھر ہاتھ ڈالا۔ تفسیر وغیرہ کتابیں بھی اخیر ہی میں نکالیں۔ ان کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ یہ کرتے کیا تھے؟ دن رات آٹھ پہر کے تو یہ کام نہیں!

تصنیفات :- (۱) دیوان اشعار۔ اس پر دیباچہ بھی خود لکھا اور ”تباشیر الصبح“ نام رکھا ہے۔ ۴۰ برس سے زیادہ کی محنت کا نتیجہ اور ۹ ہزار بیت کا مجموعہ ہے۔ لطف زبان اور سادگی مطالب کے ساتھ ہی حکمت کے باریک مسائل بڑی خوبصورتی سے نظم کئے ہیں۔ تصاید میں متقدمین کا رنگ ہے

اور تمام کلام برجستہ ہے۔ آمد کے سوا آورد کا نام نہیں +

(۲) انشائے فیضی - عرضداشتیں - خطوط - اور دیگر مضامین اس میں شامل ہیں +

(۳) خمسه - شہنشاہ اکبر نے خمسه نظامی پر طبع آزمائی کا حکم دیا - قرار پایا کہ :-

مخزن اسرار کے مقابلہ پر ”مرکز دوار“ لکھیں یہ ۳ ہزار بیت کی کتاب ہے +

خسر و شیریں کے مقابلہ پر ”سیلان و بلقیس“ ۴ ہزار بیت کا محکم تھا - متفرق اشعار ملتے ہیں +

یہلی مجنوں کے مقابلہ پر ”نل دمن“ ۴ ہزار بیت میں ہو - موجود ہے +

ہفت پیکر کے مقابلہ پر ”ہفت کشور“ ۵ ہزار بیت میں ہو - موجود نہیں +

سکندر نامہ کے مقابلہ پر ”اکبر نامہ“ اتنے ہی شعر میں ہو - متفرق اشعار ملتے ہیں +

”داستان نل دمن“ سنسکرت کے نامور شاعر کالیداس کی نظم کا ترجمہ ہے - چونکہ فیضی اس زبان کا ماہر اور فارسی پر قادر تھا لہذا خوب ہی لکھا ہے - سنسکرت کے نازک خیالات کو فارسی کے لباس میں جلوہ گر کر کے اہل زبان کا دل بگھایا ہے - اور اصل سے بھی نزاکت و لطافت بڑھادی ہے +

(۴) یللاوتی - سنسکرت میں حساب کی کتاب تھی - اس کا

فارسی میں ترجمہ کیا *

(۵) مہابھارت کا ترجمہ بادشاہ نے عبارت درست کرنے کے لئے عطا کیا۔ دو پررب (رفن) کی اصلاح کر چکے تھے کہ اور ضروری کام سپرد ہو گئے اور یہ ناتمام رہی + کہا جاتا ہے کہ فیضی نے ”بھاگوت“ اور ”اٹھروں بید“ کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ مگر مشہور ہے کہ عہد جوانی میں فیضی نے بنارس کے کسی گنٹوان پینڈٹ سے ہندو بن کر سنسکرت زبان سیکھی تھی۔ اپنا کام پورا کر چکنے کے وقت حال کھول دیا اور قصور کی سزا چاہی۔ استاد کو اگرچہ افسوس ہوا۔ لیکن شاگرد کی ذہانت اور لیاقت دیکھ کر خوش بھی تھا۔ بہر حال وعدہ لے لیا کہ ”گایتری“ کا منتر اور ”چاروں وید“ فارسی میں ترجمہ نہ کرے۔ یہ قصہ مستند نہیں *

(۶) ”تفسیر سواطع الالہام“ بے نقط عبارت میں سلسلہ کے اندر لکھی ۷۵ جُز کی کتاب ہے۔ ایک ہزار بیت کے قریب دیباچہ۔ اور ۹۹ فقروں کا خاتمہ ہے۔ سب ایک ہی صفت میں۔ کمال کیا ہے۔ خاتمہ میں یہ خوبی بھی ہے کہ اداے مطلب کے علاوہ ہر فقرہ بجائے خود تاریخ ختم کتاب ہے۔ اس پر بڑے بڑے معاصر علما نے تقریظیں لکھی ہیں *

(۷) ”موارد الیکلم“:- نصاب اور سواعظ کی باتیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں اور بے نقط الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تفسیر کے بعد لکھی۔ اس سے طبیعت کی

روانی کا زور آشکارا ہے +
 مذہب - ابوالفیض ہی پر منحصر نہیں اس کے علمی
 بھائی اور بیگانہ عصر باپ کے مذہب پر بھی لوگوں نے
 اعتراض کیا ہے - فیضی اور فضل تو علانیہ محمد اور
 دہری کہے گئے ہیں - لیکن یہ قدامت پرستوں کی بے
 انصافی اور تنگ نظری ہے - ورنہ ان کی تصانیف سے
 ان کے عقاید پر کوئی حرف نہیں لایا جاسکتا - وہ فیلسوف
 اور خود اجتہاد کا پایہ رکھتے تھے - اس لئے ہر ایسے
 حکم کی پابندی کرتے جو مستند معلوم ہو - کلیہ کے
 فقیر ہونے کے سبب معاصر علما نے جب ان سے
 نیچا دیکھا تو ان پر کفر و الحاد کا فتوے لگا دیا فیضی
 کی تفسیر موجود ہے - کوئی بات حدیث نبوی صلم اور
 اقوال سلف ج کے خلاف نہیں لکھی ہے - پھر وہ
 کیسا محمد تھا +

اخلاق و عادات :- فیضی شگفتہ مزاج - ملنسار -
 مہمان نواز - رحم دل - فیاض اور خلق دوست تھا - اس
 کا دیوان خانہ علما - شعرا اور اہل کمال کے لئے جگہ
 پناہ اور راحت منزل تھا - اکثر بلکہ تمام کالمین پہلے
 اس کے مہمان ہوتے - خود اُن سے اچھا سلوک
 کرتا - دربار میں پیش کر کے انعام و اکرام دلاتا -
 مساکین اور مظلوموں کی مدد میں کبھی کمی نہیں کرتا
 تھا - گنہگاروں کی سفارش کر کے معافیاں دلا دیتا -
 مخدوم و خادم سب کو خوش رکھتا - ہاں اہل حسد

پر اس کا قابو نہ تھا جو اپنی آگ میں خود جلتے تھے +
وفات :- سنہ ۸۰۰ کے اخیر میں مرض موت لاحق
 ہوا۔ دمہ نے ناک میں دم کیا۔ چار مہینے یہ مصیبت
 جمیل کر یہ رباعی زبان سے نکلی :-

دیدم کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد مرغ دلم از نفس بد آہنگی کرد
 آن سینہ کہ علیہ دروے گنجید تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد
 بیماری روز بروز بڑھتی اور پیچ در پیچ ہوتی چلی گئی۔

دمہ تو تھا ہی۔ جلندہر بھی ہو گیا۔ ماتھے پیروں پر
 ورم آیا۔ خونی تھے آنے لگی۔ نڈھال ہوتا چلا گیا۔

آخر میں سب سے دل اٹھا لیا۔ دو دن بالکل چپ
 رہا۔ بادشاہ اکبر خود حیات کو آئے۔ پکارا تو آنکھ
 کھولی۔ آداب بجالائے اور کچھ کہ نہ سکے دیکھ کر

رہ گئے۔ بھلا یہاں شاہی کا کیا زور تھا۔ بادشاہ بھی
 دل میں کڑھتے اور آنسو پی کر واپس ہوئے۔ بادشاہ

اسی دن شکار پر چلے گئے۔ فیضی عالم آخرت کے
 سفر پر پا برکاب تھا۔ بھائی سے کہا کہ تم چار دن

کی رخصت لے لو اور میرے پاس رہو۔ چوتھے دن
 ۱۰ صفر سنہ ۸۰۰ کو خود دنیا سے رخصت ہو گئے +

فضل و کمال کے گھر میں ماتم پڑ گیا۔ شعر و سخن نوحہ
 خواں ہوا کہ مائے لفظوں کا پر کھنے والا اور معنی کا

سادہ کار دنیا سے اُٹھ گیا۔ بیماری کی حالت میں اکثر
 یہ شعر پڑھا کرتے تھے :-

گر ہمہ عالم ہم آید بجنگ بہ نشود پاسے یکے مور لنگ

سری کرشن

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ - ہندوستان جنت نشان
کا بے نظیر خطہ - اور اگر سرزمین بھارت کو جسم فرض
کیا جائے تو اس میں بمنزلہ ”دل“ کے ہے - اس ملک
میں دریاے ”جمنا“ کے کنارے ہندی الاصل ویدانت
مذہب کے معتقدین کا ایک متبرک مقام شہر ”متھرا“
آباد ہے - یہی وہ شہر ہے جہاں ہندو مذہب کے
مقدس رہنما ”سری کرشن“ ہمارا ج نے ظور فرمایا - اور
جن کی پاکیزہ و سبق آموز زندگی کے حالات ہم ناظرین
کی نذر کرنا چاہتے ہیں +

شہر ”متھرا“ کے مضافات میں کوسوں تک دریائے
”جمنا“ کی پُر لطف رودانی زمین کو سیراب اور سرسبز
بناتی چلی گئی ہے - اور دریا کی بالائی سمت میں شہر
مذکور سے کچھ دُور پر ایک ہرا بھرا جنگل ہے - اس
میں ”تال“ - بگل - اور کدم کے جھلارے درختوں کے
گھنے انبوہ تھے - جن کے پنج پنج میں جگہ جگہ تھوڑے
تھوڑے فاصلے سے سبزہ زاروں کا نکھار - اپنا روپ
دکھا کر دل کو بھاتا تھا - ان سبزہ زاروں میں ہر
طرف ہرے بھرے پیڑوں کے سایہ تلے صاف اور

لہ ایک قسم کا درخت ہے جو اب بھی ہندوستان میں پایا جاتا ہے
اور اسی نام سے موسوم ہے - لہ موسری کا درخت +

میٹھے پانی کے چشمے بہ رہے تھے۔ دُوب کے سبز
مخلی فرش پر مرگوں کے غول کلیلیں کرتے درختوں کی
چھاؤں میں موہنی صورت کے مور اپنے منقش پروں
کو پھیلانے ناچتے نظر آتے۔ اور اس جگہ کو ”متھرا
باشیوں“ کی دلفریب سیرگاہ بناتے تھے۔ یہی وہ
بندرا بن ہے جس کو کنھیا جی کے بزمِ طرب کا مقام
مانا جاتا ہے۔ اور ”جادون“ خاندان کے زن و مرد
چھوٹے بڑے سب یہیں آ کر آرام زندگی کے لطف
حاصل کرتے +

شہر متھرا کے نشیب کی سمت تھوڑی سی مسافت
پر لبِ دریا ”گوکل“ نامی ایک گاؤں تھا۔ یہ
گوالوں کی بستی اور بڑی پُر لطف جگہ تھی۔ چرواہوں
کی یہ قوم نوشت و خواند۔ علم و فضل اور فلسفہ و
حکمت کے فوائد سے تو آگاہ نہ تھی۔ لیکن آزاد
زندگی۔ سادہ مزاجی۔ طبیعت کی پھلبلاہٹ۔ دیانت
و عفت اور رحم و محبت کے اوصاف و جذبات
میں اپنی آپ نظیر تھی۔ عورت و مرد لڑکے اور
لڑکیاں۔ جوان اور بوڑھے سب ان خوبیوں میں
برابر اور زندگی کی سچی مسرت سے بہرہ ور تھے۔
گوالوں کے سردار ”نند جی“ اور ان کی بی بی
”جودھا جی“ دونو اپنی قوم کے لئے عمدہ عادات
و پسندیدہ اطوار رکھنے کے باعث موجب فخر اور
عہدہ سرداری کے ہر طرح لائق۔ جماعت میں سربراہ اور

اور ہر دل عزیز تھے ”نند جی“ اپنے وسیع اخلاق کے سبب اسے ”ستھرا“ کے شاہی خاندان میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔

ستھرا کا راجہ کنش جو اس وقت تخت سلطنت پر تھا - ظلم و بے رحمی کا پتلا - غضب کا سفاک - شگدل اور سخت گیر تھا - رعایا اس کے ظلم و ستم سے نالاں تھی - اور اس کی شاہی سطوت کے آگے عاجز و حیران - مجال کیا تھی کہ کنش کے خلاف کوئی دم مارے - مجرم کا دل ڈبہ سے میں رہتا ہے وہ ضمیر کی لعنت مستنا اور اس کی وجہ سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے - کنش بھی با اینہم شان و شکوہ دشمنوں سے بہت ڈرتا اور اپنی جان کی طرف سے فکر میں رہتا تھا - ایک بار بخومیوں کو جمع کر کے پوچھا کہ علم جوتش کا حکم لگائیں اور بتائیں کہ اس کی زندگی کا دشمن کون ہے ؟ جوتشیوں نے بچار کیا - اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر حساب کر کے بتایا کہ اس کی بہن ”دیوکی“ کا آٹھواں نخت جگہ اس کی جان کا گاہک بنیگا - اور اسے قید حیات سے چھڑاویگا - کنش نے بہن اور بہنوئی ”واسدیو“ کو قتل کرنے کا قصد کیا - مگر ان دونوں بے گناہوں نے رو دھو کر اور یہ وعدہ کر کے کہ وہ اپنے پارہ ماے جگہ کو بخوشی کنش کے حوالے کرتے رہیں گے تاکہ وہ ان کو قتل کر دے - اپنی بھان بھائی - کنش نے بہن اور بہنوئی کو اپنے زیر نگرانی قید رکھا -

جب ان کے کوئی بچہ ہوتا۔ ظالم کش ہمشیرہ زادہ کے خون سے فوراً ہاتھ رنگتا۔ اور اسی طح اس نے بہن کے سات فرزند تلف کئے اور اُن کے خون اپنی گردن پر لئے +

ولادت۔ پرورش اور تعلیم و تربیت :- سری کرشن مہاراج کے نسب۔ خاندانی حالات اور جاے سکونت کا پتا سن چکے۔ اب یہ سنو کہ وہ پیدا ہو کر زندہ کیونکر بچے۔ اور کہاں اور کس طح پرورش پائی + ظالم راجہ کنس منظومہ ”دیوکی“ کے سات نور چشم پے در پے بڑی بے رحمی سے مار چکا تھا اور ”دیوکی“ کو آٹھواں حمل رہا تو وہ سخت مغموم ہوئی۔ مامتا کا جوش اسے کسی طح چین نہیں آنے دیتا تھا ”واسدیو“ بھی اس سے کم پریشان و رنجیدہ نہ تھے۔ دونو نے صلاح کی کہ اس مرتبہ اپنے دل کے ٹکڑے کو جیسے بھی بن پرے زندہ بچانا چاہئے۔ ”واسدیو“ کی ”نندجی“ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ دونو میں باہمی صلاح ہوئی۔ اور ایسی تجویز قرار پا گئی۔ جس سے ”واسدیو“ کا آٹھواں بیٹا موت کا شکار نہ ہونے پائے +

”سری کرشن جی“ نے جنم لیا تو اس دن اور وقت خدا کی خاص قدرت سے نہایت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ رات کا وقت۔ گہرے بادل۔ اندھیرا چھایا ہوا۔ ہوا زلزلے کی چلتی تھی۔ ”واسدیو“ بچہ کے وجود میں آتے ہی اس کو کبل میں پیٹ کر

”گوکل“ لے گئے۔ اور ”نند جی“ کی لڑکی اس کے بجائے
لے آئے۔ جو اسی وقت پیدا ہوئی تھی۔ یہ کارروائی
نمائین پرودہ داری سے انجام کو پہنچ گئی۔ اور راجہ
کنن نے صبح کو معصوم لڑکی کے خون سے ہاتھ
رنگے ”سری کرشن“ زندہ بچ رہے +

”نند“ اور ”جسودھا“ دونو پاک دل شوہر اور بیوی
حقیقی ماں باپ سے بڑھی ہوئی شفقت کے ساتھ
”داسدیو“ اور ”دیوکی“ کے اس سخت جگر کو پالنے
لگے۔ یہ ”جادون“ خاندان کا شہزادہ ”گوکل“ میں
گوالوں کے بچوں کی طرح پرورش پا کر پروان چڑھا۔
سارا گاؤں اس کی موہنی صورت پر فدا تھا۔ بہت
سے پیارے پیارے نام اس کو دئے گئے تھے۔
مگر دو نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اول وہ
نام جو پالنے اور دودھ پلانے والی ماں ”جسودھا“
کا دیا ہوا تھا۔ وہ ان کو ”کنھائی“ کہہ کر بلاتی تھیں۔
اور دوسرا عام نام جو گوالوں کے فرقے میں مشہور
تھا وہ ”سری کرشن“ تھا +

تعلیم و تربیت کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت
نہیں۔ گوالوں کے فرقے میں پڑھنے لکھنے یا آداب
مجلس وغیرہ کا ذکر ہی کیا تھا۔ ماں وہ مویشی کی
پرورش۔ ان کی حفاظت۔ اور ان کا دودھ دوسٹے۔
دہی جمانے۔ اور گھی بنانے کے فن میں ماہر تھے۔
اور اسی لحاظ سے مویشی چرانے کی خدمت ”سری کرشن“

کو بھی سپرد ہوئی۔ کیونکہ گوالوں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا پہلا ذمہ یہی تھا۔

سری کرشن ”بانسلی“ خوب ریلی بجاتے تھے۔ سننے والے مست ہو کر ان کے گرد جمع ہو جاتے گوگل کی گوالنیں ان کی نئے نوازی پر فریفتہ تھیں۔ اور انہیں گھیر کر ان کی سرسائی نئے کی بیخود کر دینے والی تانیں سنا کرتی تھیں۔ اسی ”نئے“ کا منصب ”سری کرشن“ کے آخری حصہ عمر میں ”ناقوس“ (سنگھ) کو حاصل ہو گیا جس کی مہیب اور دل ہلا دینے والی آواز میدان جنگ میں بہادروں کا جوش و انہردی بڑھایا کرتی تھی۔

”سری کرشن“ ”گوگل“ کے باشندوں کی جان تھے۔

ان کی محبت اہل ”گوگل“ کے دلوں میں عام انسانی الفت سے بہت بڑھ کر اور عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ لڑکے لڑکیاں۔ جوان مرد اور عورتیں۔ اور بڑے بوڑھے سب ایک ساں ان سے مانوس تھے۔ بچپن کے ایام کا وہ حصہ جو گھر میں گزرا۔ اس میں ”سری کرشن“ کی شوخیاں گوگل والوں کو تنگ کرتی تھیں۔ پڑوسیوں کے گھر میں چھپکے سے جا کر دودھ اور کھن چکھ آنا۔ برتن توڑ ڈالنا۔ اور ایسے ہی بہت سے نقصان کر دینا ان کا کام تھا۔ مگر کوئی ان کی شکایت نہ کرتا۔ یہ حالت اُس وقت خانہ کو پہنچ گئی جبکہ ”سری کرشن“ اپنے باپ کی گائیں چرانے کی خدمت پر مامور ہوئے۔

”جودھاجی“ تو اس نور دیدہ کو اس کام پر بھیجنا

نہ چاہتی تھیں۔ لیکن مجبوراً انہیں ماننا ہی پڑا۔ پھر بھی طح طح کے مرغوب کھانے پکا کر ان کے ساتھ کر دیتیں۔ اور گھر سے بہت دور نہ جانے۔ دریاے جمنا کے پار نہ ہونے۔ اور راجہ کنس کی نظر سے بچنے کی ہدایت کرتی رہتیں۔ سری کرشن کے ہمن لڑکے اس وقت تک کبھی چراگاہ کو نہ جاتے۔ جب تک ان کے پیارے ”کنھاٹ“ ساتھ نہ ہوں۔ ہر ایک کھیل بغیر ان کی شرکت کے کھیلا ہی نہ جاتا۔ ان کی ایجاد سے نئے نئے کھیل انہیں معلوم ہوتے ”بانسلی“ کی میٹھی تانیں سننے میں آتیں۔ اسی بچپن کے عہد میں ”سری کرشن سے چند ایسے کام ظہور میں آئے جو انسان کی طاقت سے بالاتر خیال کئے گئے۔ بہت سے خونخوار جنگلی جانور انہوں نے ہلاک کئے اور ایک مرتبہ دریاے جمنا کے اندر ایک قاتل کالا سانپ مارا جس کو ”کالی ناگ“ کہا جاتا تھا +

سری کرشن کی عمر گیارہ بارہ سال کی ہوگی جب ان کی ہم عمر گول کی گوپیاں ان کے بانسلی بجانے کی عاشق زار ہو گئیں۔ پہلے دریاے جمنا کے ”پنگھٹ“ پر اور پھر قرب و جوار کے سبزہ زاروں میں گوپیوں کا سری کرشن کے گرد جھاؤ رہتا۔ چاندنی راتوں میں ان کی نئے نوازی سے نازنین گوپیاں مست ہو کر وجد و رقص میں آیا کرتی تھیں۔ مختلف کھیل تماشے ہوتے۔ بارش میں جھولے پڑتے اور بہار کے موسم

میں عبیر و گلال کے تمغوں سے ہولی کھیلی جاتی۔ ان جلسوں میں گول کے سارے گوال اور گوپیاں شریک ہوتیں۔ یہ صحبتیں بیہودہ نفسانی جذبات سے پاک تھیں۔ یہاں صرف سچی محبت کی روحانی لذت حاصل کی جاتی تھی۔ ایک بار ”بندرا بن“ میں ”سری کرشن“ نے ”رہس“ یعنی دائرہ بنا کر ناچنے کا عظیم الشان جلسہ ترتیب دیا۔ قرب و جوار کی حسین و سہ پارہ گوپیاں عمدہ لباس اور پھولوں کے زیور سے آراستہ اس میں شریک ہوئیں۔ ٹکھری ہوئی چاندنی رات کا سناٹا اور اس میں ایسا دلنریب نظارہ۔ تعلیم کی زبان چاک ہے اور طاقت نہیں رکھتی کہ اس کا خاکہ لفظوں میں سمیٹ کر دکھا سکے۔ ”سری کرشن“ سلطنت عشق و محبت کے بادشاہ تھے۔ خیلِ خوبانِ گول ان کا لشکر تھا۔ گول کا ایک ایک آدمی ہر عمر و درجہ کا دل سے ان پر نرا اور ان کا معتقد تھا۔ اس ارادت اور عقیدت کا ثبوت حسبِ ذیل واقعہ سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ۔ ایک بار گول کے سب بزرگ ”اندر دیوتا“ پر قربانیاں چڑھانے کے واسطے بڑا بھاری جگ (جشن) کرنے والے تھے۔ تیاریاں دیکھ کر ”سری کرشن“ نے اپنے بزرگ باپ سے دریافت کیا۔ ”یہ کیسا سامان ہے؟“ ”نند“ نے جواب دیا۔

”پیارے بیٹے! ہم زمانہ کی رسم کے مطابق اندر دیوتا کی پوجا اور اس پر بھیٹ چڑھانے کی تیاری

کرتے ہیں۔ اندر بارش کا دیوتا ہے۔ مینہ مہی کے
محکم سے برشا ہے۔ اور بارش سے کھیت ہرے
ہوتے ہیں۔ اناج کی پیداوار ہوتی ہے۔ اور انسان
کی روزی کا سامان حاصل ہوا کرتا ہے۔“

”سری کرشن“ کی عمر ابھی بچپن ہی کی حد میں
تھی۔ وہ کوئی عالم اور ہنر والے نہ تھے۔ مگر باپ
کی گفتگو سن کر انہوں نے جو موثر وعظ کیا۔ اس
کا بگواؤں کے دل پر ایسا گہرا نقش جما کہ وہ
اپنے مدتوں کے قدیم عقاید کو ترک کر کے ان کی
نئی تعلیم کے پابند ہو گئے۔ ”سری کرشن“ نے فرمایا:-

انسان کی ہستی اس کے کاموں کا پھل ہے۔ اس
کی پیدائش۔ اس کا دکھ اور سکھ۔ اس کی بھلائی برائی
سب کرموں کا نتیجہ ہے۔ نہ آدمی کوئی کام کرے اور
نہ کوئی انجام سکھے۔ پس دنیا میں جو چیز اعلیٰ اور
برتر ماننے کے قابل ہے وہ یہی اعمال ہیں۔ اندر کی
پرستش ایک عبث فعل ہے۔ اُس کے اختیار میں کچھ
بھی نہیں۔ دنیا قدرت کاملہ سے وابستہ ہے اور
قدرت خالق اکبر کا فعل۔ اس لئے فعل ہی خدا ہے۔
اور ہماری زندگی کرموں پر مبنی ہے۔ اگر ہم کو جینا
منظور ہو تو چاہئے کہ ہم کام کریں۔ اور پرستش کے
لائق بھی وہی چیز ہے جو ہم کو زندہ رکھتی ہے۔
گاٹیں ہماری زندگی بسر کرنے اور روزی کمانے کا ذریعہ
ہیں۔ اور ان کی پرورش کا ذریعہ ہمارے سامنے والی

گوبردھن پہاڑی - ہم قربانیاں کریں تو انہی کے واسطے کریں - اندر کو بھینٹ چڑھانا لا حاصل ہے؟
 سری کرشن کی یہ تعلیم گواہوں کے دل میں تیر گئی - وہ اپنے کہنے عقیدے سے دست بردار ہوئے - روحانی بہبودی کا سیدھا راستہ پا کر "سری کرشن" کے پیرو بنے - اور گوبردھن پہاڑی پر جا کر قدرت کاملہ کی پرستش میں مصروف ہوئے *

سری کرشن کے کارنامے پہلے ہی سے شہرت پا چکے تھے - اس واقعہ نے ان کا نام اور چمکا دیا - یہ خبریں "متھرا" کے مگھی کوچوں میں مشہور ہوئیں - راجہ کنس نے بھی سن سن پائی - مجرم کا دل کانپ گیا - فکر دامنگیر ہوئی "سری کرشن" کا حال چال دریافت کرنے پر مخبر اور جاسوس لگائے چند مرتبہ چپکے سے اُن کو ہلاک کرا دینا چاہا - مگر یہ تدبیر پیش نہ گئی - کنس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "سری کرشن" اس کی بہن "دیوکی" کا بیٹا ہے - نند کا فرزند نہیں - غم و غصہ میں پیچ و تاب کھانے لگا - بظاہر ضبط کیا - لیکن دل میں آگ لگی تھی - اور آنکھیں اس آگ کے شعلوں کو نمایاں کرتی تھیں - کھلے بندوں "سری کرشن" پر ہاتھ ڈالنا غیر ممکن تھا رعایا جو ان کی عاشق اور مرید تھی بگڑ جاتی - فوج کی طرف سے دھڑکا تھا کہ "سری کرشن" سے مقابلہ نہ کریں گی - منصوبہ باندھا کہ مکر سے اُن کو مروا ڈالے *

’ متھرا کا ایک شخص ”اکرور“ نامی ”سری کرشن“ کا پارفار تھا اور راجہ کنس نے اس کو دربار میں بلوایا۔ بڑی آؤ بھگت۔ عزت سے بٹھایا۔ اور تحائف دے کر پیوں کہنے لگا:-

”اے نیک مرد! ہم نے سنا ہے کہ ”کرشن“ ہماری بہن ”دیوکی“ کے فرزند ہیں۔ ہمیں غیرت آتی ہے کہ جادوں خاندان کا شہزادہ گھوس کا بیٹا بن کر رہے۔ ان کو متھرا میں آکر شہزادوں کی طرح رہنا چاہئے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ تمہاری ”سری کرشن“ سے گہری دوستی ہے۔ تم ہی یہ پیغام لے کر جاؤ اور انہیں متھرا میں لے آؤ۔ تاکہ وہ یہاں آکر شانہ شان سے زندگی بسر کریں۔“

”اکرور“ یہ شاہی پیغام لے کر ”گوکل“ پہنچا۔ وہاں خوشی اور غم کی توام حالت پیدا ہوئی۔ گواوں کی قوم اپنے محبوب رہنما کی جدائی سے نیچین اور اس کے عروج سے خوش تھی۔ مگر مفارقت کا صدمہ خوشی پر غالب تھا۔ ”سری کرشن“ نے ان کو تسکین دی۔ اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے ”اکرور“ کے ساتھ ”متھرا“ میں آئے۔

راجہ کنس نے بڑی شان و شوکت سے ان کی آمد پر خوشی کا جلسہ کیا۔ خوب خاطر داری کی۔ اُلفت بزرگانہ کا اظہار کیا۔ اور جلسہ میں خوشی کے کھیل تماشوں کا انتظام فرمایا۔ کھیلوں میں گھونسہ بازی کا حصہ

بھی رکھا تھا۔ اس کام کے جاننے والوں کو پہلے ہی چمکے سے سکھا دیا تھا۔ کہ ”سری کرشن“ کو زندہ نہ چھوڑنا۔ ”سری کرشن“ سے کہا گیا کہ وہ گھونسا بازی کے کرتب میں شریک ہوں۔ یہ تناڑ گئے کہ ”ہو نہ ہو کچھ وال میں کالا ضرور ہے۔“ اہل جلسہ کو بھی راجہ کی بد نیتی کا حال معلوم ہو گیا۔ اور اب اس راز کا پردہ اُلٹ گیا تھا۔

سری کرشن نے غونچوار مشیت زن کو دم کے دم میں مار ڈالا۔ اور اس سے نبٹ کر راجہ کنس کو بھی ہلاک کر دیا۔ جلسہ میں ہلچل پڑ گئی۔ ہر طرف سے واہ واہ۔ اور مرجا کی آوازیں اُٹھیں۔ مٹھرا والوں نے متفق ہو کر ”سری کرشن“ کو تاج و تخت پیش کیا۔ مگر ان کو حکومت اور سلطنت کی ہوس نہ تھی۔ انہوں نے اپنے بڑھے نانا ”راجہ اگریہین“ کو جسے نالائق کنس نے قید کر رکھا تھا۔ بندی خانہ سے نکلوا کر تخت پر بٹھایا اور اس سے کہا :- ”میں نے کنس کو اس لئے نہیں مارا کہ تاج و تخت لوں۔ وہ بڑا ظالم تھا۔ آس کی بدکرداری حد سے بڑھ گئی تھی۔ میں نے محض خلق خدا کو اس کے ظلم سے بچانے کے لئے اس کی جان لی۔ تمہارا تخت و تاج تمہیں مبارک رہے۔ تم جادوؤں خاندان کے مکھیا ہو۔ اب تخت پر بیٹھو اور حکومت کرو۔ میری دلچسپی کا سامان گوکل کے رمنوں سے بڑھ کر اور کہیں نہیں ہو سکتا۔“

۱۰ پھر کنس کی بیوہ رانیوں اور دیگر عزیزوں کی طرف جو گریہ و نوازی کر رہے تھے متوجہ ہو کر ان کے قدموں پر گرے۔ خطا کی معافی مانگی۔ اور شاہی جلوس کے ساتھ کنس کو اول منزل پہنچانے کا حکم دیا۔ پھر مسب کو تسکین دلائی۔ راجہ کنس کی لاش جلا دی گئی۔ اور راجہ اگرسین تخت پر بیٹھا۔ ”سری کرشن“ کو تحصیل علم کا شوق ہوا۔ اور ایکبارگی طبیعت نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس شعر کے مصداق ہو گئے۔ ۷

”اگلا سا وہ مزاج وہ عادت نہیں رہی
وہ ہم نہیں رہے وہ طبیعت نہیں رہی“

”سری کرشن“ میں بچپن کی شونیاں۔ طفلی کی عاشق مزاجی۔ دل لگی۔ اور پھل بازی۔ کوئی بات نہیں رہ گئی تھی وہ اب متین۔ مدبر۔ حکمرانی کے اچھے ماہر۔ اور بہت اعلیٰ درجہ کے منتظم ہو گئے تھے۔ عزیز ہمن۔ ننگوٹے یار۔ پیاری گویاں۔ مہربان ماں باپ جسو وھا اور نند بھول گئے۔ بلکہ جب وہ گول سے چل کر ان کو لینے کے واسطے متھرا آئے تو سری کرشن نے کمال ثنات کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ اب مجھے وہ پہلا ”سری کرشن“ نہ سمجھو بلکہ خاندان جادوں کے شہزادہ کی نظر سے دیکھو۔ بہر حال متھرا میں خوشی اور گول میں غم و الم چھایا۔ اور ”سری کرشن“ کو اہل عالم کی تلقین و اصلاح کے لئے علم حاصل کرنے کی ضرورت نے ”سندی پن“ رشی کی خدمت میں پہنچایا +

اعلیٰ تعلیم: ”سری کرشن“ اور ان کے سوتیلے بھائی ”بلرام“ نے ”سندی پن“ رشی کی خدمت میں کئی سال بسر کئے۔ اس عرصہ میں یہ گوشہ نشین عابد اور روشن ضمیر عالم و فیلسوف اپنے فیضانِ علم سے ان کے باغِ طبع کو سیراب و شاداب بناتا رہا۔ سری کرشن اور بلرام اس کامل استاد کے پاس علومِ فلسفہ اہلبیات - سیاستِ مدن، اور اصولِ حکمت کی اعلیٰ اور اکمل تعلیم پا کر فارغ ہوئے۔ اسی دوران میں وہ جنگی فنون میں بھی دستگاہ حاصل کرتے رہے تھے۔ فطری قابلیت کو تعلیم و تربیت نے خوب جلا دے دی۔ اور یہ تمام مروجہ زمانہ علوم و فنون میں طاق ہو کر مٹھرا میں واپس آئے۔

جنگی اور انتظامی لیاقت: سری کرشن میں عالی دماغی - فکر رسا - بلند حوصلگی - استقلال اور جرات کی خوبیاں پہلے ہی موجود تھیں۔ علم کے جوہر نے ان اوصاف کو اور چار چاند لگا دئے۔ وہ اب اپنے وطن کی سچی اصلاح پر کمر بستہ ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ خاک ہند کی حالت اندرونی جھگڑوں - ظالم راجوں اور شریر آدمیوں کی وجہ سے سخت نازک ہے۔ رحمِ دل - انصاف پسند حکمران نایاب ہیں۔ مظلوموں کی مدد اور ملک میں امن و آسائش قائم کرنے کی بیحد ضرورت ہے۔ کیونکہ بروں کا دور دورہ ہونے سے اچھے اور نیک آدمی جنگلوں میں بھاگ گئے تھے اور جان چھاتے پھرتے تھے۔ مٹھرا کی سلطنت کے رکن بن کر پہلے وہ اپنے ہی

وسیع وطن اور صوبہ کی حالت سدھارنے میں مصروف ہوئے۔
 - سری کرشن کے طالب علمی کے زمانے اور غیبت میں
 راجہ ”جرا سندھ“ متھرا پر چڑھ آیا۔ اس کی دو بہنیں
 راجہ کنس کو بیاہی تھیں۔ کنس مارا گیا تو زنڈاپا کاٹنے
 کے ارادے سے اپنے بھائی کے ہاں چلی گئیں اور جادوں
 خاندان اور سری کرشن کی شکایتیں کر کے اُس کو طیش
 دلا دیا۔ ”جرا سندھ“ ایک زبردست راجہ تھا۔ اس نے
 بھڑری لشکر لے کر متھرا پر دھاوا کیا۔ لیکن غنیمت یہ
 ہوا کہ سری کرشن عین وقت پر متھرا پہنچ گئے۔
 اور غنیم کو مملکت جادوں کی حدود سے مار کر باہر نکال
 دیا۔ اور صرف یہی نہیں کیا۔ بلکہ ”جرا سندھ“ کے سترہ
 زبردست حملے پے در پے روکے اور اس کو شکست
 پر شکست دیتے رہے۔ اٹھارہویں دفعہ ”جرا سندھ“
 شودر راجہ ”کالباہن“ سے مل گیا۔ ”کالباہن“ شمالی
 علاقہ کی سب شودر پہاڑی قوموں کا زبردست لشکر
 لے کر متھرا پر بڑھا۔ سری کرشن کے پاس کافی فوج
 نہ تھی۔ انہوں نے تہور چھوڑ کر دور اندیشی سے کام
 لیا جو اصلی شجاعت ہے۔ پیش بندی کے طور پر سمندر
 کے کنارے ایک نیا اور بیحد مستحکم شہر ”دوارکا“ نامی
 تعمیر کیا۔ اہل متھرا کے عیال و اطفال اس میں بھیج
 دئے۔ دوارکا پر قبضہ کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بلکہ
 ناممکن۔ پھر جو انہروں کی جماعت ساتھ لے کر خود
 ”کالباہن“ سے لڑے۔ دشمن کو لڑائی کی گھات سے

مار لیا۔ اور اس کی فوج کے دانت کھٹے کر کے فتعیاب ہونا ہی چاہتے تھے۔ کہ یکایک ”جواسندھ“ بلائے ناگمانی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور ”سری کرشن“ کے بہادر سرفروش بدحواس ہو کے میدان سے بھاگ نکلے۔ ہزیمت خوردہ سپاہ روکے سے نہ رکی۔ اور غنیم کے تعاقب نے اس کو فنا اور پراگندہ کر ڈالا۔ ”سری کرشن“ کسی تدبیر سے بچ کر بخیریت ”دوارکا“ میں پہنچ گئے۔

اگرچہ اس شکست نے ”سری کرشن“ کی جنگی قوت مضل اور سست کر دی تھی۔ لیکن ان کا تدبیر اور اعلیٰ لیاقت انتظامی تو ان کے پاس ہی تھی۔ انہوں نے بہت جلد اپنی خطا نہ کرنے والی تدبیروں اور بے نظیر حکمت عملیوں کے ذریعے سے ملک ہند کے تمام حکمرانوں پر وہ فوقیت حاصل کر لی کہ ہر تاجدار کو ان کی نظر مہربانی کی آرزو اور چشم عتاب کا خوف رہتا تھا۔ معمولی راجوں مہاراجوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ کورو اور پانڈو جیسے زبردست مہاراجگان۔ کہ شہنشاہ ہند۔ تھے ”سری کرشن“۔ جی کی اطاعت و فرماں برداری کو اپنی سعادت تصور کرتے اور ان کی رہنمائی کے محتاج تھے۔ ”بھیشم پتاما“ جیسا بے مثل جنگجو بہادر اور ملکی مدبّر ”سری کرشن جی“ کو خدا کا اوتار اور پرستش کا سزاوار ماننا تھا۔ کوہ ہمالیہ سے منگھا اور دوارکا سے کچھیا تک تمام تاجور ان کے زیرِ محکم تھے۔ اور ہندوستان کی سیاست اور مذہب دونوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آگئی

تھیں۔ سب آدمی ان کی اعلیٰ فراست کے قائل۔ اور
دل و جان منے سچے عشق کے ساتھ ان کی پرستش کرتے
تھے +

سری کرشن نے متعدد شادیاں کیں۔ پہلی شادی رانی
”رکمنی“ سے ہوئی۔ ان کی تمام بیبیاں اعلیٰ محکمان
گھرانوں کی بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے گوکل کے طاقت ور
گوانوں میں سے دلیر و شیر دل جوان منتخب کر کے
اپنی فوج میں بھرتی کئے۔ رعایا کو خوشحال بنایا اور
ظاہر ہے کہ بغیر ان تدابیر کے کوئی حکمران ملک میں
ہر دلعزیز۔ اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔
ملک کے اندرونی جھگڑے سب طے کر دئے۔ تباہی اور
بربادی کا گھر اُجاڑ دیا۔ ظالم تاجداروں کو سزائیں دیں۔
دنیا کو ان کے وجود سے پاک کیا۔ جابروں کو رحم دل۔
ظالموں کو عادل اور بے اطمینانوں کو مطمئن بنایا۔ ان
کارروائیوں سے ہندوستان درحقیقت جنت نشان ہو گیا۔
اور لطف یہ کہ ”سری کرشن جی“ نے یہ سب کچھ فوج
و اسلحہ کے زور سے نہیں کیا۔ بلکہ اپنی سیاست دانی
اور بے مثل فہم و تدبیر کے وسیلہ سے۔ اصل یہ ہے کہ
اہل ہند کیا راجا۔ اور کیا پرچا اطوار سب کے بگڑ گئے
تھے۔ دلوں میں رحم و محبت کی کسک باقی نہ رہی تھی۔
بد اخلاقی اور جور و تعدی کی بلا عام تھی۔ ”سری کرشن جی“
نے اپنی تلقین اور تدبیر سے ان خرابیوں کو دور کر
دیا تو دنیاۓ ہند کے چمن میں پھر تازہ رونق اور

ہمار آگئی *

اخلاق و عادات :- ایک مصلح ملک - مدبر - نیک خصال فیلسوف کی حیثیت سے دیکھو تو - اور مذہبی ریفاہ - واضح آئین انصاف اور تائید غیبی سے موید مانو تو بھی - ہر حال "سری کرشن جی" کی زندگی ایک بچہ پاکیزہ زندگی ہے - اُن کے اخلاق و عادات کا جلوہ اگرچہ ان کے کارناموں کے آئینوں میں بخوبی موجود اور نمایاں ہے - لیکن اچھا ہوگا کہ ہم آپ کو خود انہی کی زبان سے سُنوا دیں کہ وہ کیا تھے اور اپنی نسبت کیسی راے رکھتے تھے سری کرشن جی "اپنی عزیز بی بی "رکنی" ہمارانی سے فرماتے ہیں :-

"تم نے بڑے بڑے بادشاہوں اور راجوں کی درخواست شادی نا منظور کر کے مجھے اپنی زندگی میں شریک بنانا منظور کیا تو کیوں ؟ میں کسی سلطنت کا حکمران نہیں - دشمنوں کے ڈر سے ساحل سمندر کے ایک شہر میں بند پڑا ہوں - میرا چال چلن دُنیا بھر سے نرالا ہے - برتاؤ کی وہ کیفیت کہ عام لوگوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا - میرے دل کا راز کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا - میری بی بی کیا زندگی کا لُطف پا سکتی ہے - مجھے غریبوں - اور آفت کے مارے ہوؤں سے اُس ہے - امیروں کے ساتھ میل ملاپ پسند نہیں - عیش و عشرت - گھر با - - - بال بچے کسی کی محبت اور تمنا میرا دل نہیں گرماتی - جسے کہ اپنے بدن تک کی بھی مجھ کو خبر نہیں رہتی -

میرے جیسے آدمی ہمیشہ اپنے ہی اوپر بھروسہ کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی پر قانع رہتے ہیں۔ پیاری باتم نے مجھ سے شادی کر کے بڑی غلطی کی ہے۔

سری کرشن سچے عاشق۔ چکے دُنیا دار۔ مشہور ملک کے منتظم۔ لائق سلطنت کے مدبر۔ بیحد کامل فیلسوف۔ اور نہایت بزرگ راہنما تھے۔ ایک اونے دودھ پیچنے والے کے بیٹے سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ کے آدمی بن گئے۔ تمام حکمرانان ہند ان کی سرداری کو دل سے مانتے۔ اور ان کی رہنمائی کے پیرو بنتے تھے۔ وہ فیلسوفانِ عصر کے استاد ہوئے۔ اور ہر بات میں کمال کا مرتبہ پایا۔ مگر خود نمائی۔ ذاتی عزت کا خیال۔ اور خود عرضی ان میں مطلق نہ تھی۔ ان کا اصلی منشا دُنیا میں سچی محبت اور ہمدردی۔ حقیقی امن اور خوشحالی۔ بے داغ سرت اور سعادت کی اُمنگ پیدا کرنا تھا۔ اور جس طرح بن پڑا وہ اپنی اس غرض کو مکمل کر گئے۔

ان کی مظلوموں اور کمزوروں کی مدد کا جلوہ پانڈوں شہزادوں کے حالات کا آئینہ سامنے رکھ کر دیکھو۔ راج کنواری دروپدی کے سوئمبر میں شہزادہ ارجن نے پھیلی

لے راجپوت قوم کے راجوں کا دستور تھا کہ دوشیزہ لڑکیوں کی شادی کے لئے ایک جشن کرتے۔ اس میں تمام راجے اور راج کنور جمع ہوتے۔ لڑکی محفل میں آتی اور جس کو پسند کر کے بار پہنا دیتی اسی کے ساتھ بیاہ دی جاتی۔ اس جشن کا نام ”سوئمبر“ تھا۔ کبھی اس میں کوئی خاص شرط بھی ہوتی تھی جس کی تکمیل حصولِ مراد کا سبب بنتی۔ مولف

کی آنکھ کا نشانہ اڑایا اور راج کنواری کو جیت لیا۔ راجپوت
 دیروں کو غصہ آیا کہ ایک برہمن اُن کے گھرانے کی لڑکی
 پر قابض ہوا جاتا ہے۔ پانڈو شہزادے حالت جلا وطنی
 میں بھییں بدلے اور برہمن بنے پھرتے تھے۔ جلسہ میں
 تھلک پڑ گیا۔ ناکام اور مایوس بہادر شہر یار "ارجن" پر
 جھپٹے۔ مگر سری کرشن جی "نے سب کو روکا اور" ارجن
 کے حق میں فیصلہ کیا۔ اس امر سے معلوم ہوتا ہے کہ
 وہ کہتے یا اثر شخص تھے۔ اور تمام ہندوستان کے حکمران
 کیونکہ ان کی بات دل و جان سے مانتے تھے۔ پانڈو
 شہزادوں کو انہوں نے پہچان لیا تھا۔ اُسی وقت سے وہ
 پانڈو کے دوست۔ مشیر اور رہنما ہو گئے +

مہابھارت کی خونریز لڑائی میں پانڈو کبھی کامیاب
 اور منصور نہ ہوتے اگر "سری کرشن جی" کی اعلیٰ جنگی
 تدابیر اور انوکھے فلسفہ اور نئی تعلیم کا قدم درمیان
 نہ ہوتا۔ ہمیشہ اور درونا جیسے سرآمد دلیران زمانہ ان
 ہی کی تدبیر سے مارے گئے۔ ارجن کا یہ عہد کہ وہ
 عزیزوں اور بھائیوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیگا سری
 کرشن جی نے ٹکڑوایا +

مگدھ دیش کے ظالم و خونخوار راجہ "جراسندھ" کی
 زندگی کا خاتمہ ان ہی نے کیا یہ بد سرشت راجہ کمزوروں
 کو ستایا اور ان کا ملک و بایا کرتا تھا۔ اور یوں پانڈو
 مہاراجوں کا "راج سوگت" بے خطر بنا دیا "جراسندھ" شہزادہ
 لے یہ جشن وہی فاتح راجہ کر سکتا تھا۔ جو تمام معاصر حکمرانوں کو مغلوب
 اور زیر اثر بنا لیتا تھا + مولف

”بھیم“ (پانڈو) کے ہاتھ سے دست بردست جنگ میں مارا گیا۔ خاص جشن کے دوران میں ”راجہ رسپال“ کے غرور اور بد زبانی کی وجہ سے ”سری کرشن“ نے اس کو خود قتل کیا۔ اور کورؤں کو اس سبب سے تباہ کرایا۔ کہ وہ بد باطن - شریک - غاصب - اور ناحق کوش تھے۔ پہلے ان کو بہت فہمائش کی کہ ”پانڈو“ بھائیوں کو تھوڑا سی علاقہ دے دو اور انہیں در بدر سرگرداں نہ پھراؤ۔ لیکن ”کورؤں“ کو اپنی طاقت کا ٹھنڈ تھا۔ انہوں نے یہ نصیحت آئی گئی کر دی اور لڑائی کے سوا کسی امر کو نہ مانا۔

سری کرشن کی تعلیمات :- ہم اوپر کہیں مختصر طور پر سری کرشن جی کی تعلیمات کا ماحصل درج کر چکے ہیں۔ اور اب ”جنگ مہابھارت“ کا ذکر آجانے پر ان کے فلسفہ اور سیاسی مذہب کا کسی قدر اجمالی ذکر بھی مناسب سمجھتے ہیں۔ ہم نے اوپر لکھ دیا ہے کہ مہادر ”ارجن“ نے اس خونریز لڑائی میں جنگ سے باز رہنے کا عہد کر لیا تھا۔ حالانکہ بغیر اس کے شریک رزم ہونے کے پانڈو بھائیوں کے سر فتح کا سہرا کبھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

سری کرشن جی نے ارجن سے کہا :- روح کو قاتل یا مقتول سمجھنا نادانی اور حماقت ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ تم کو یہ مان کر کہ روح غیر فانی ہے۔ کسی بات کا رنج و غم ہی نہ کرنا چاہئے۔

دنیا عالم مثال ہے یا عالم برزخ کا سایہ - اس نمودار
سایہ کے پرے ایک اور لازوال عالم ہے نہ تمہارے
دنیوی کام شراب کے مانند بے اصل ہیں - وہ ذاتی طور
پر مطلق پائدار نہیں - نہ عالم برزخ پر کوئی اثر ڈالتے
ہیں - غرضکہ اس عالم کے لئے تمہارے کسی فعل کا نفع
نقصان کچھ بھی موثر نہیں ہوتا - اور تمہاری ہستی ایک
خواب سے زیادہ نہیں +

انسان خود بینی کے دھوکے میں آکر اپنے تئیں
افعال کا خالق اور فاعل تصور کرتا ہے - حالانکہ یہ بات
ہرگز نہیں - ہر کام قدرت کاملہ کی خاصیتوں سے وجود
میں آتا ہے - خالق حقیقی مصدر افعال ہے - اور وہی
اس کل کو چلاتا رہتا ہے - انسان کو بلا خواہش اجر اور
کسی غرض رکھنے کے بغیر کام کرنا لازم ہے - انسانی
وجود کی بقا افعال پر منحصر ہے - انسانی افعال اپنے
نتیجوں کی صورت میں قائم رہتے - اور وہ نتائج پھر دوسرے
نئے افعال پیدا کر دیتے ہیں - انسان مرتا ہے مگر اس
کے باطنی افعال نہیں فنا ہوتے - روح کو قید مادہ سے
قطعی آزادی دلانے کا ذریعہ جوگ اور ریاضت ہے -
زہد باطنی کے لئے انسان کو اپنے لازمی فرائض ادا کرتے
رہنے کی حاجت ہے - اپنی زندگی کے فرائض ادا کرنے

لے خواب کا سا عالم جس کی اسیت کچھ نہ ہو - محض دھوکے کی مٹی +
۵۔ وہ عالم جو حقیقت و مجاز کے مابین ہے - مگر یہاں ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ عالم حقیقت مراد لیا ہے - واللہ اعلم + مؤلف

والا شخص جس کو اجر اور صلہ کی خواہش نہیں ہوتی وہ دنیا کی جھیل میں کنول کے پھول کی طرح تیرتا ہے ۔ اور حوادث کی موجوں کے تھپیڑے اس کو ذرا بھی صدمہ نہیں پہنچا سکتے ۔

انسان کو اپنے نیک و بد ہر قسم کے فرائض ادا کرنے ضروری ہیں ۔ جو شخص اپنی وہ خدمت بجالاتا ہے جسے قانون قدرت نے اس کے حوالے کیا ہے وہ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ۔ انسان کو اپنے وہ فرائض ضرور ادا کرنے لازم ہیں جن کے واسطے وہ پیدا کیا گیا ہے ۔ زاہد و عابد وہی شخص ہے جو اپنے کرم کا ثمرہ پانے کی آرزو کئے بغیر کام کرتا رہے ۔ ایسے اعمال کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے ۔ اول یہ کہ ان کی کوئی غرض اور خاص خواہش نہ ہو ۔ اور دوم یہ کہ وہ نیک اور پاک عمل ہوں ۔ انسان خدا پر بھگتی (عشق حقیقی) کے ذریعے سے ایمان لا سکتا ہے ۔ وہ قدرت کاملہ کے صحیفہ کا مطالعہ کرتا ہے اور ہر شے میں ایک ایسی روح اور ہستی کا معائنہ کرتا رہتا ہے جس کا دریافت کر لینا غیر ممکن ہے ۔ اور اس کے آگے اپنی ہستی بالکل پہنچ پاتا ہے ۔ قدرت کاملہ کی معرفت تربیت کی محتاج ہے ۔ اور تربیت تعلیم سے حاصل ہوتی ہے ۔

ہر حال یہ روکھی بحث ہم زیادہ نہیں بڑھاتے ۔ کیونکہ ناظرین کی دلچسپی میں خلل آنے کا خوف ہے ۔ صرف اس خیال سے کہ ایسے اعلیٰ اور اہم رہنما کی

تعلیمات کا بیان نہ کرنا ایک قسم کی فروگزاشت ہوگی۔ ہم نے موٹے موٹے اصول مجمل طور پر درج کر دیے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے ”گیتا“ کا ترجمہ دیکھنا چاہئے جو ہمارا ماخذ ہے۔ اب ہم صرف اس قدر اور بتاتے دیتے ہیں کہ اسی تعلیم نے ”ارجن“ کو جنگ پر آمادہ کیا۔ اور وہ میدان رزم میں دلیری اور تیغ زنی کے جوہر دکھا کر ”کوروں“ پر ”پانڈو“ کی فتحیابی کا سبب بنا۔ سری کرشن کی تعلیم نے ”ارجن“ پر یہ بات واضح کر دی کہ گو ”کورو“ اس کے عزیز ہیں۔ بچھا زاد، بھائی ہیں۔ ہم خون ہیں۔ لیکن جب ان کو اس عزیز داری اور قربت کا پاس نہیں۔ وہ ہمارا حق نہیں دیتے اور سرکشی دکھا کر جنگ پر آمادہ ہیں۔ ہمارے خون کے پیاسے بنے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے مقابلے کی ہر طرح کوشش نہ کریں۔ اور حق شنائی اور حفاظت خود اختیاری کے طریقے پر نہ چلیں۔ جنگ میں لڑنے والے کا فرض اپنے حریف کو مغلوب بنانا ہے۔ اور یہ فرض جس طرح بھی ممکن ہو ادا کرنا واجب۔ لڑائی میں دھوکا کھیلنا ضروری ہے اور نشان دہانی۔ چنانچہ ”ارجن“ لڑا اور کامیاب ہوا +

وفات :- ”سری کرشن جی“ کے حالات میں آپ دیکھ چکے ہونگے کہ وہ کس مقصد کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ نیکو کاری اور امن و امان کا دور دورہ کرنا ان کا اصلی مڈما تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان

ہمکے تمام شریر اور بد طینت لوگوں کو فنا کیا اور کرایا -
 لیکن ابھی ایک جرگہ شیطان سیرت انسانوں کا اور باقی
 تھا - اور وہ ان کے خاندان کے آدمی مع ان کے
 بیشمار بیٹوں اور پوتوں کے تھے - ان کو سزا نہ دینا اور
 دنیا کو ان کے وجود سے پاک نہ کرنا ہم کو سری کرشن
 جی کے پاکیزہ مقصد کا قائل نہ بناتا - مگر انہوں نے
 اپنی تعلیم کو عملاً ثابت کر دکھایا ہے - اس واسطے ہم
 مجبور ہیں کہ انہیں کامل اور ستیا رہنما مانیں - ”کوروں
 ان کے قریبی رشتہ دار تھے انہیں تباہ کرا دیا - تو سری
 کرشن نے خاص اپنے کنبے والوں کی سزا دہی کا
 سر انجام کیا +

وہ ان سب کو ”پرواستش“ کی بڑی جاترا کے لئے
 لے گئے - یہ مقام نہایت پُر نصا ہے اور مشہور - جادوں
 خاندان کے شہزادوں کو اس جاترا کی بڑی ٹھوسی ہوئی -
 سب نے زور شور سے سفر کی تیاریاں کیں - ہر قسم
 کے سامان راحت بافراط لئے - شراب ناب کے خم
 کے خم ہمراہ تھے - جاترا کے مشہور مقام میں پہنچ
 کر پہلے دینی ریسیں بھا لائے - غریبوں اور برہمنوں کو
 خیرات اور نذر تقسیم کی - پھر عیش و طرب کی محفل چلی
 اور جام شراب کا دور چلا - اس خانہ خراب بلا کی مضرتیں
 محتاج بیان نہیں ہیں - اس کے نشہ نے دماغ گرم
 کئے اور عریضہ بازیاں ہونے لگیں - ہوتے ہوتے سخت
 کلامی - اور پھر کشت و خون کی نوبت آ گئی - آپس میں

لڑنے لگے۔ جادوؤں خاندان کے شہزادے کٹ کٹ کر رہے تھے اور ان میں زور کی طائے جنگی برپا تھی۔ سری کرشن "بجائے اس کے کہ بیچ بچاؤ کرتے خود بھی بلوڑوں میں رہ کر اپنے ہی ہاتھوں سے اولادِ افتاد کے سر کاٹتے رہے۔ اس طرح بہت جلد تمام خاندان تباہ ہو گیا۔ اور اکیلے "سری کرشن" باقی رہ گئے۔

اس واقعہ کے بعد سری کرشن نے اپنے رتھ بان کو حکم دیا کہ "ہستنا پور" جائے اور ان کے دوست اور شاگرد رشید "ارجن" سے پیغام کہے کہ "دوارکا" کی بیس اور بیوہ شہزادیوں کو اپنے زیر سایہ "ہستنا پور" میں لا کر رکھیں۔ اور ان کی حفاظت کریں۔

اس سے عیاں ہے کہ اب سری کرشن کا ارادہ اپنے دار الملک "دوارکا" میں واپسی کا نہ رہ گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنا فرض ادا کر چکے تھے اور سرزمین ہند کو شرمیروں سے خالی کر کے یہاں امن و آسودگی کا دور دورہ مکمل بنا گئے تھے۔ لہذا اب دنیا میں ان کے وجود کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ سری کرشن نے اپنے رتھ بان کو روانہ کر کے مقتول عزیز و اقارب کی بے گور و کفن لاشوں پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی۔ اور پھر پیادہ پا ایک طرف کی راہ لی۔

راستہ طے کرتے کرتے ایک سرسبز درخت کے سایہ میں ٹھہرے۔ اور وہیں پڑ کر سو گئے۔ کچھ دیر کے

بند اس طرف ایک شکاری کا گزر ہوا۔ وہ گھنے اور
جھاڑیوں میں گھرے ہوئے درخت کے نیچے پتھروں کی
آڑ میں سری کرشن کے جسم کی جھلک دیکھ کر سمجھا کہ
کوئی شکار ہے۔ فوراً شست باندھ کر نشانہ لگایا۔ اور
سری کرشن نے تیر کے کاری زخم سے اسی درخت
تیلے جان شیریں اپنے خالق کے سپرد کر دی۔ اور
ظلم و ستم اور بد اخلاقی اور بد اطواری کی تارپی کا
ٹانے والا مشعل افروز ہدایت پھر اسی اخفا کے گھاٹوں
اندھیرے میں چھپ گیا جہاں سے اس نے بطور کا
نور چمکایا تھا۔

کنفیوشس

بزرگ اعظم ایشیا میں علم الہیات اور فلسفہ و حکمت
کے شائع کرنے والے۔ اور خدا کی مخلوق کی اصلاح
و بہبودی میں جد و جہد سے کام لینے والوں میں
”کنفیوشس“ ایک اعلیٰ مرتبہ کا شخص ہوا ہے۔ یہ
نامور حکیم اور مقنن ملک چین میں حضرت مسیح ۶
سے پانسو برس قبل پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنی
زندگی کا اکثر حصہ بندگان خدا کے اخلاق و اطوار
کے سدھارنے میں بسر کیا تھا۔ سیاست مدن کے
متعلق کنفیوشس کی تحقیقات اور اس کی تعلیمات

کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور اس علم میں اسے امام زمانہ بلکہ موجد اور یگانہ مانا جاسکتا ہے ۛ

نام و منصب :- کنفیوشین - مشہور نام - اور کنگ فوزی اصلی نام ہے۔ اس کے نسب کا سلسلہ ایک بادشاہ سے ملتا ہے۔ وہ بادشاہ حضرت مسیح ۲ سے دو ہزار سال قبل گزرا تھا۔ کنگ فوزی کا باپ اپنے ملک میں حاکم فوجداری (مجسٹریٹ) تھا۔ اور ملک چین میں یہ منصب خاص اہل علم کا حق مانا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ کنگ فوزی کا خاندان علم و حکومت کا گھر اور ملک کے ممتاز طبقہ میں شامل تھا ۛ

ولادت :- کنگ فوزی ملک چین کے صوبہ "لو"

کے ایک ضلع میں پیدا ہوا۔ اس کی ولادت ۵۵۱ سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ اور وہ یونان کے نامور حکیم فیثاغورث کا ہمعصر تھا ۛ

تعلیم و تربیت :- ایک علمی گھرانے میں پیدا ہونے والا بچہ اکثر خود بھی علم و فضل کا شائق ہوتا ہے۔ اور ایسا نہ بھی ہو تو خاندان کا طرز معاشرت اور ممتاز درجہ اسے علم کی طرف راغب بنا دیتا ہے۔ ملک کے نامی گرامی خاندان میں پیدا ہو کر کنگ فوزی اچھی تربیت اور مناسب تعلیم سے محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ اور یہی ہوا۔ یعنی اس نے لڑکپن ہی کے زمانہ میں ابتدائی علوم - زبانہانی - ملکی قانون اور فلسفہ و حکمت میں حیرت انگیز ترقی حاصل کر لی ۛ

ابھی کنگ فوزی اپنے گلشن عمر کی صرف تیسری بہار تک پہنچا تھا کہ باغبان مجازی یعنی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا پرورش کا کفیل ہوا۔ اور ماں خدمت گزاری کرتی رہی۔ مگر وہ بیوہ و بیس سر کا تاج اُترتے ہی افلاس کے مہیب چنگل میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اور اسی وجہ سے اپنے لعل کی پوری طرح دل کھول کر پرورش اور اس کے لئے ناز و نعمت کے سامان مہیا نہیں کر سکتی تھی۔ کنگ فوزی اپنی طبیعت سے بیحد متین اور مہذب واقع ہوا تھا۔ جبکہ اس کی عمر کے اور بچے اپنا وقت فضول کھیل کود میں گزارتے اس وہ اپنے بزرگ۔ عالم اور صاحب عزت دادا کی صحبت میں رہ کر اس کے اخلاق و اطوار کی تقلید کرتا اور یوں خاموشی کے ساتھ ایک نہایت مفید سبق حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کا دل قدتا متقدمین اور اگلے زمانہ کے مشہور آدمیوں۔ عالموں اور حکیموں کا قدر شناس تھا +

کنگ فوزی اپنے دادا سے تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ اور جب اس کا دادا فوت ہو گیا تو ایک دوسرے عالم سے جو قضاات اور حکومت کے منصب پر مامور تھا۔ تحصیل علم کی۔ وہ ۱۴ برس کی عمر ہونے تک اس دوسرے استاد کی صحبت سے فیضیاب ہوتا رہا اور اس عرصہ میں اس نے وہ کمال بہم پہنچایا جو اس کی فطری ذہانت اور خاندانی عزت کے شایان شان تھا +

ملازمت سرکاری :- تحصیل علم کے بعد جب کنگ فوزی کو بکمال و فضل میں شہرت حاصل ہوئی تو اسے سلطنت کی خدمت سپرد ہو گئی۔ وہ نائب قاضی بنایا گیا۔ اس کا خاص کام غلہ کی اور اس کی تقسیم کی نگرانی تھی۔ اس لین دین میں مدتوں سے بڑی ابتری پھیل رہی تھی۔ دکاندار اور غلہ کو تقسیم کرنے والے کئی قسم کی سخت بے ایمانیاں اور بہت سے فریب کر کے لوگوں کو پریشان کرتے اور نقصان پہنچاتے تھے۔ ”کنگ فوزی“ کی جد و جہد نے یہ تمام خرابیاں بہت جلد دور کر دیں۔ اور اس کی کارگزاری نمایاں ہوتے ہی اس کو ۲۱ سال کی عمر میں معقول ترقی مل گئی۔ اب وہ مویشیوں کے گلوں اور ان کی چراگاہوں کا اعلیٰ نگران مقرر ہوا۔ اس خدمت کو حاصل کرتے ہی کنگ فوزی نے ایسا عمدہ انتظام کیا کہ ملک کی زرعی حالت اور زراعت پیشہ جماعت میں ترقی و خوشحالی کی ایک نئی روح پھنک گئی +

یہ دوسرا عمدہ پانے سے تین سال قبل ۱۹ سال کی عمر میں کنگ فوزی نے ایک نامی خاندان کی عورت ”کی گوانشی“ کے ساتھ شادی بھی کر لی تھی۔ اس بی بی سے اس کے یہاں ایک ہونہار لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام ”پی پی“ رکھا گیا۔ اور یہ فرزند باپ کے سامنے ہی ایک اولاد فریہ اپنی یادگار چھوڑ کر پچاس سال کی عمر میں فوت ہوا۔ ”پی پی“ کا بچہ اور کنگ فوزی کا پوتا بھی اعلیٰ درجہ کا ذہین اور تیز طبع شخص نکلا۔ اور وہ

اپنے نامور دادا کا سچا خلف ثابت ہوا۔
کنگ فوزی کا دل عورتوں سے کچھ بھی مانوس نہ
تھا۔ اس نے نفع انسان کے اس حصہ کی طرف کوئی
خاص التفات نہیں کی۔ خود اس نے اپنی بی بی کو
شادی کے چار ہی برس بعد طلاق دے دی۔ اس علیحدگی
کی وجہ یہ ظاہر کی کہ بی بی کی موجودگی اس کے مطالعہ
اور سرکاری کاموں کی انجام دہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔
مطالعہ اور علمی زندگی :- ۲۳ سال کی عمر
میں کنگ فوزی کی ضعیفہ ماں دُنیا سے کوچ کر گئی۔ اب
ملکی رسم و رواج کے موافق کنگ فوزی کو اپنا سرکاری
منصب ترک کرنا پڑا۔ کیونکہ چین میں یہ قدیم دستور
تھا کہ ملازم سلطنت اپنے والدین میں سے کسی ایک
کے مرتے ہی ملازمت سے قطع تعلق کر لیتا تھا۔ کنگ
فوزی نے ماں کو بڑی دھوم دھام سے اول منزل
پہنچایا۔ اور اس کا یہ فعل ملک میں پسندیدگی کی نظر
سے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ لوگ اسے نمونہ بنا کر اس
کے مقلد ہوئے۔ ملکی طریقہ یہ تھا کہ مردوں کو بنجر
اور ویران زمین میں دفن کیا کرتے تھے۔ کنگ فوزی
نے اس کے خلاف اپنی ماں کی لاش ایسی جگہ سپرد
خاک کی جو نہایت سرسبز اور دلکشا تھی۔ اسی طرح اس
نے دوسری رسموں میں بھی کتر بیونت کی۔ اور پھر
اس کی ہر ایک بات اہل ملک کے واسطے دستور العمل
بن گئی۔ حتیٰ کہ آج تک چین میں نادار اور مفلس

شخص کے سوا باقی تمام آدمی اپنے یہاں کے مردوں کو نہایت دھوم اور جلوس سے کفن دیتے اور دفن کرتے ہیں +

کنگ فوزی نے تجھیز و تکفین میں نئی نئی باتیں داخل کرنے کے علاوہ یہ رسم بھی نکالی کہ والدین کی وفات کے بعد ان کی اولاد ایک معین عرصے تک ان کا سوگ رکھے۔ اور پھر خاص خاص اوقات میں ان کی یاد برسی کے فاتحہ یا عرس کے ذریعے تازہ کرتی رہے۔ اس رسم کا اصلی مقصد تو یہ تھا کہ نامور اور اہل علم و فضل کے پس ماندگان اپنے بزرگوں کا نام و ناموس محفوظ رکھنے میں سعی کرتے رہیں۔ اور ان کی یاد سے اپنے خاندانی اعزاز کی یاد کو تازہ کیا کریں۔ مگر افسوس ہے کہ مرور آیام کے ساتھ یہ پاکیزہ غرض تو فوت ہو گئی اور اس کی جگہ بت پرستی اور مشاہیر پرستی نے اپنے قدم جما لئے ہیں۔ اگرچہ چینی اب بھی اپنے بزرگوں کی برسیاں کرتے اور ان کے نام سے مکان میں الگ حجرے اور کمرے بناتے ہیں۔ لیکن یہ بات کنگ فوزی کے مدعا سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے قبروں پر یا گھروں کے خاص حصوں میں بزرگوں کے عرس کا جلسہ کرنے کی یہ رسم تجویز کی تھی کہ اولاد اپنے باپ دادا کی خوبیاں یاد کر کے ان کی تقلید بنے اور سعادت حاصل کرے۔ نہ یہ کہ اس طرح بت پرستی کا رواج ہر جگہ +

کنگ فوزی نے دیکھا کہ اس کے طرز عمل کو اس کے ہم وطن اس قدر پسند کر رہے ہیں کہ اب اسی کی پیروی خود بھی کرتے ہیں۔ تو اس نے اتنا اور اضافہ کیا کہ تین سال کامل اپنی ماں کے سوگ میں ایک الگ مکان کے اندر گوشہ نشین رہا۔ اس عرصہ میں اس کا شغل صرف کتب بینی تھی۔ وہ اخلاقی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور کوشش کرتا رہتا تھا۔ کہ اصول اخلاق کی ماہیت سمجھ کر ان پر عمل کرنے کی قوت پائے۔ اور اپنے دل میں اس کا شوق پیدا کرے۔ وہ اپنی خاندانی عزت سے فائدہ اٹھا کر بہت کچھ دولت و حشمت پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے دولت دنیا کی پروا نہیں کی۔ اور اپنے اہل ملک کو اخلاق و عمل کی تعلیم دینے پر کمر باندھ لی۔

کنگ فوزی کا خیال تھا کہ جب تک اگلی رسمیں بعد کی نا واجب زیادتیاں اور بے محل نقائص سے پاک ہو کر پھر ملک و قوم کے لئے دستور العمل نہ بن جائیں گی۔ اس وقت تک ملک کا نظم و نسق۔ خانہ داری کا بندوبست۔ اور اہل ملک کی فلاح و بہبودی کبھی صورت پذیر نہ ہو سکیں گی۔ کنگ فوزی نے اپنے ہوطنوں کو نیکی اور خوش اخلاقی کی طرف راغب بنانا شروع کیا۔ اور اس کام کی تکمیل کے لئے اس نے ایک خاص مدرسہ کھولا۔ اس مدرسہ میں وہ اپنے خیالات اور مسائل کی تعلیم دیتا تھا۔ اور اس کارروائی کے ساتھ ہی دوسری طرف وہ

اپنے فلسفہ اور تعلیمات کو چند کتابوں میں بھی مدون کرتا رہا تھا۔ تاکہ اس کی یہی تصانیف اس کی دائمی یادگار بنیں۔ اور نفع انسان کی اصلاح میں موثر ثابت ہوں *

کنگ فوزی کی عمر ابھی صرف سینتیس سال کی تھی کہ وہ ملک میں ایک مشہور فیلسوف - معلم اخلاق - اعظم درجے کا مدرس - اور نامی گرامی واعظ ہو گیا۔ دنیا کا جاہ و جلال اس کی نظر میں اگرچہ بھیج تھا۔ لیکن ایک سرکاری عہدہ دار اس سے بالکل بے تعلق بھی نہیں بن سکتا۔ کنگ فوزی کے ساتھ نوکر چاکر - سواری اور سامان جلوس کا رہنا لازمی تھا۔ مگر امارت و حکومت کے ٹھاٹھ باٹھ پر اس کے علمی اقتدار کا پلہ غالب تھا۔ اور طلبہ کی کثیر جماعت ہر وقت اس کے گرد حلقہ کئے رہتی تھی۔ اور اب وہ کنفیوشیس کے نام و لقب سے معروف تھا۔ کنفیوشیس نے ایک بزرگ حکیم کا ذکر سنا جو چین میں مشہور تھا۔ یہ اس سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ملنے گیا۔ اس حکیم کا نام "لاوزی" تھا۔ لاوزی نے کنفیوشیس کو دیکھتے ہی کہا "عقل مند آدمی عدلت پسند ہوتے اور دنیاوی دولت و عرق کے فریب میں نہیں پھنستے۔ وہ زمانے کا رنگ و ڈھنگ دیکھتے اور ہوا کا رخ پہچانتے ہیں۔ بولنے کا موقع دیکھا تو بولے ورنہ چپ رہے۔ یہ ان کا طریقہ ہے۔ نیک آدمی اپنی نیکی کا اعلان نہیں کرتے اور نہ دنیا میں اپنے عقل مند

ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں۔ بس میں تم کو اتنی ہی نصیحت کرنا چاہتا تھا۔ اب تم اس سے جو نفع اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ کنفیوشیس حکیم لاؤزی کے یہ حکمت آمیز کلمات پپ چاپ رہ کر کمال غور سے سنتا رہا۔ اور کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس ملاقات کے بعد سے اس کی یہ نادت ہو گئی تھی کہ کوئی شاگرد کچھ دریافت کرتا تو وہ نہایت مختصر اور جامع جواب دے کر خاموش ہو جاتا تھا +

کنفیوشیس بندگان خدا کو ترک دنیا۔ اور زہد و ریاضت کی تعلیم نہیں دیتا تھا۔ وہ حکیم سقراط کا ہم خیال تھا۔ اس کا اور سقراط۔ دونوں کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو تارک الدنیا بننا زیبا نہیں۔ اور یہ کوئی تقویٰ نہیں۔ بلکہ سچا تقویٰ اور طاعتِ الہی یہ ہے کہ آدمی دنیا کے کار و بار میں مصروف رہے۔ سارے تعلقات کے جھگڑے انگیز کرے۔ مگر اپنے اخلاق۔ عادات اور اطوار ایسے پاک و صاف بنالے کہ دنیا والے اس کی ذات سے امن و راحت پائیں اور وہ بھی مطمئن اور خوش رہ کر زندگی بسر کرے +

کنفیوشیس نے تین سال کی نگہبانی اور عزت نشینی میں قدیم زمانہ کے حکما کی کتابیں غور سے دیکھی تھیں۔ وہ ان کی حکمت کا ماہر بن گیا تھا۔ وہ معائنہ کرتا تھا کہ اہل چین یوں تو اپنے بزرگوں کے بڑے مداح ان کے اقوال پر دلدادہ اور ان کی عزت و حرمت میں حد

درجہ کی کوشش کرنے والے ہیں۔ لیکن ان سے یہ نہیں ہوتا کہ اپنے سلف کے قول پر عمل بھی کریں اور قول و فعل کو ایک کر دکھائیں۔ کنفیوٹشیس اپنے وطن والوں کو ایسا ہی بنانا چاہتا تھا۔ اور اسی غرض سے اس نے بہت سی کڑیاں بھیلیں۔ سختیاں برداشت کیں۔ اور ایذاؤں سہیں ۛ

کنفیوٹشیس نے کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سیر و سیاحت کا قصد کیا۔ تاکہ جو مسائل کتابوں میں پڑھے ہیں ان کو تجربہ کی کسوٹی پر بھی کس کر پوری طرح ان کی صداقت آزما لے۔ وہ اپنے وطن سے نکلا۔ اور ایک غیر ریاست میں گیا جس کا نام ”کن“ تھا۔ یہاں کنفیوٹشیس نے علم موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ اور بعد ازاں ملک بملک پھرتا پھرتا ”زی“ کے ملک میں پہنچ گیا۔ یہاں کے حکمران نے کنفیوٹشیس کو بندگان خدا کے بگڑے ہوئے اخلاق سدھارنے اور ان کی عادتیں سنوارنے کے عمل پر مامور کیا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کی ناموافقت نے کامیابی کی صورت دیکھنے کا موقع نہ دیا اور کنفیوٹشیس بہتیری کوشش کے بعد تھک کر وہاں سے بھی بھل بھاگا۔ وہ ”زی“ میں ایک سال تک مقیم رہا تھا۔ زی۔ سے روانہ ہو کر کنفیوٹشیس سیدھا شہنشاہ چین کے دربار میں پہنچا۔ دار السلطنت کا شاہی کتبخانہ اس کے لئے کھول دیا گیا۔ اور یہ کئی عیسے ملک کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا۔ کنفیوٹشیس ملکی تاریخ کی

جس قدر زیادہ ورق گردانی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اُسے زمانہ کے تغیر اور اہل وطن کے عادات و اطوار کی ابتری پر حسرت آتی تھی۔ آخر جب یہاں بھی اس کا دل نہ لگا اور نہ کوئی کام چلا۔ تو وہ پھر اپنے اصلی وطن ”کو“ میں واپس چلا آیا۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ خوب بڑھایا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں تین ہزار سے زائد طلبہ اس کے پاس فراہم ہو گئے۔ جن میں سے پانسو مختلف ملکی ریاستوں کے معزز عہدہ دار تھے *۔

کنفیوٹیشین کے پیرو اکثر سن رسیدہ آدمی ہوتے تھے۔ وہ اپنے گھربار کے کام و ہندوں میں لگے رہتے۔ محنت و مشقت سے روٹی کھاتے۔ اور اپنے اخلاق کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ جب کوئی شک و شبہ ہوتا۔ فاضل استاد کے پاس آ کر اس کا دُفعیہ اور اپنا اطمینان کر لیتے۔ کنفیوٹیشین کے شاگرد چار جماعتوں میں منقسم تھے۔ پہلی اور ابتدائی جماعت کو محض اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسری جماعت میں فصاحت و بلاغت کا درس ہوتا تھا۔ تیسری جماعت علم سیاست میں پڑھا کرتی تھی اور چوتھی جماعت میں اعلیٰ زبانہانی اور انشا پردازی کا فن سکھایا جاتا تھا۔ لیکن اخلاقی تعلیم لازمی تھی۔ بغیر اس جماعت سے کامیابی کے ساتھ گزرے ہوئے آگے ہرگز ترقی نہیں ملتی تھی *۔

کنفیوٹیشین کا قول تھا: جس آدمی کے اخلاق درست

نہیں وہ کسی کام کا نہیں ہو سکتا *
 وہ کہتا تھا کہ اگر آدمی کسی فن میں کمال حاصل کرنا
 چاہے تو پہلے اپنی عقل کو اس کدورت سے صاف
 کرے جو اس پر سچ کی خوبی اور جھوٹ کی بُرائی کھلنے
 نہیں دیتی۔ بغیر اس کے وہ کمال کی خوبیوں کو نہیں
 پا سکتا۔ اور طبیعت کا یہ رنگ جہلی ہوتا ہے۔ یا
 پچھین میں اچھی تربیت نہ ملنے کے سبب سے آئینہ دل
 کو لگ جاتا ہے۔ لہذا انسان کا پہلا فرض یہی ہے کہ
 اپنے آئینہ دل کو جلا کرے *

کنفیوٹیشین کو گانے بجانے کا از حد شوق تھا۔ وہ
 اکثر کہا کرتا کہ ”میرے نزدیک نغمہ صرف اتنی ہی دیر
 کے لئے دل بھلاؤ نہیں کہ جب تک آدمی اسے سُنتا
 رہے اور وہ اس کے کانوں کو بھلا معلوم ہو۔ بلکہ اس
 کی تاثیر بعد میں بھی رہتی ہے۔ اور اس کے ذریعے
 سے انسان کو نئے نئے خیالات سوچتے اور نئے نئے
 تصورات اس کے دماغ میں آتے ہیں“ کنفیوٹیشین
 شکار بھی بہت کرتا تھا۔ اس کے لئے اس نے قدم
 کی کتابوں سے ایک سند نکال رکھی تھی *

کنفیوٹیشین نے اپنے اہل وطن کو بہت فائدہ پہنچایا۔
 اس نے بڑی محنت اور جانکاهی سے چین کی تاریخوں
 کے خلاصے کئے اور جو اگلی کتابیں بے کار ہو گئی تھیں
 انہیں از سرفو درست بنایا۔ اور درس میں داخل کیا *
 اشنائے سیاحت میں مملکت ”زی“ کے بادشاہ نے

کنفیوٹیش کی اس درجہ تنظیم کی کہ اس کو اپنے سے بالاتر بٹھانا چاہا۔ اور کہا کہ حکما ہمیشہ بادشاہوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ مگر کنفیوٹیش نے منظور نہ کیا۔ آخر اس بادشاہ نے اس کو اپنا وزیر بنایا۔ مگر درباریوں کی شرارت کے آگے اس کی کچھ حکمت نہ چل سکی۔ اس سبب سے تھوڑے عرصے بعد وہ پھر اپنے وطن میں چلا آیا۔ اب کنفیوٹیش کا شہر اس درجہ ہو گیا تھا کہ وطن میں آتے ہی بادشاہ کی طرف سے بڑا منصب اسے عطا ہوا یعنی لوگوں کے اخلاق کی نگرانی اور تہذیب اس کو سپرد ہوئی۔ کنفیوٹیش نے یہ کام اس خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اہل "تو" کے اخلاق بے انتہا سنور گئے۔ بادشاہ کے دل میں اس کی اتنی جگہ ہو گئی کہ اس کو تمام قاضیوں کا اسٹل افسر مقرر کر دیا اور وہ اختیارات عطا کئے کہ بادشاہ کے بعد کسی اور شخص کو نہ تھے۔ جس وقت یہ منصب اسے عطا ہونے لگا تو اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ جب تک وزیر اعظم کو جس کے بد ہونے کے سبب خلقت میں بُرائیاں پھیلی ہیں پھانسی نہ ملیگی۔ بندگان خدا کے ادب کا سدھنا ممکن نہیں۔ اگرچہ بادشاہ اول یہ بات سن کر اپنے دل میں ڈرا مگر آخر اس کے کہنے پر عمل کیا۔ کنفیوٹیش نے خو کھڑے ہو کر اپنے سامنے وزیر کو پھانسی دلائی اور جیسا کہ اس نے سوچا تھا کسی

طرح کا فتنہ و فساد نہ ہوا۔
 کنفیوٹشیس نے ملک کی حالت اتنی اچھی بنادی تھی
 کہ قرب و جوار کے بادشاہوں کو مملکت ”لو“ کی ترقی
 پر رشک و حسد ہو گیا اور اس ملک کے قدیم مخالفین
 ”زی“ کے بادشاہ نے ”لو“ کے بادشاہ کو دام فریب
 میں ایسا پھنسا یا کہ کنفیوٹشیس کا کیا کرایا سب خاک میں
 مل گیا۔ اس نے اتنی نہایت جوان اور پری تمثال
 عورتیں جو فن موسیقی میں طاق تھیں۔ لو کے حکمران کو
 ہدیہ بھیجیں۔ ہر چند کنفیوٹشیس نے بادشاہ کو اس
 فریب کے مال سے آگاہ کیا مگر بادشاہ پر اس کی
 نصیحت موثر نہ ہوئی۔ ان عورتوں میں سے ایک بیچہ
 دلربا عورت نے ”لو“ کے بادشاہ کو اپنے دام محبت
 میں اسیر کر لیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس کی دوسری
 ساتھیوں نے دیگر درباری امرا اور ارکان سلطنت کو
 اپنا فریفتہ بنا کر انہیں عیش و عشرت اور راگ رنگ
 میں مبتلا کر دیا۔ حکام کی عیش پرستی اور غفلت نے
 ملک کا انتظام درہم و برہم کر دیا۔ تجارت میں بے ایمانی
 کا دخل ہوا۔ مخلوق تنگ آ چلی۔ اور بد اخلاقی عام
 ہو گئی۔ کنفیوٹشیس کی عقل چکرائی۔ اور جب پُرانے پُرانے
 امیروں کو بھی سمجھا کر دیکھ لیا اور اپنی بات کی کچھ
 تاثیر نہ پائی تو ناچار عمدہ سے مستغنی ہوا اور وطن
 کو چھوڑ کر ایسے شاگردوں کی تلاش میں نکلا جو کبھی
 لغزش نہ کھائیں۔

کئی سلطنتوں میں پھرا مگر اس کا مطلب حاصل نہ ہوا۔ سب کو بدتمصلتی اور بد اخلاقی میں خوش اور اسی پر قانع پایا۔ کنفیوٹیش کو اگرچہ ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ لیکن وہ بے دل نہیں ہوا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ حکیم کا گھر سارا جہان ہے۔ ایک جگہ کسی نے میری بات نہ سنی تو دوسری جگہ بہت سے سننے والے ہو جائیں گے۔ مگر اس کو کوئی ٹھکانا نہیں ملا۔ جہاں گیا وہیں لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ بلکہ بعض جگہ کسی نے سنا بھی تو حاکموں نے تلوار کے زور سے انہیں ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ وہ اسی سبب سے قید بھی ہو گیا۔ اور اس کا اور اس کے شاگردوں کا کھانا پینا بند رہا۔ اسی مصیبت کے عالم میں جب کنفیوٹیش کی عمر ۶۶ سال کی تھی۔ اس کو خبر پہنچی کہ اس کی بی بی فوت ہو گئی ہے۔ کنفیوٹیش نے اسی وقت خیال کر لیا کہ اب میری وفات کا زمانہ بھی قریب آ پہنچا ہے۔

افسوس جس زمانہ میں کنفیوٹیش ہوا اس زمانہ میں بڑا فتنہ اور فساد پھیل رہا تھا اور اس وقت کے لوگ ہواؤ ہوس میں ایسے گرفتار تھے۔ کہ اگرچہ ہر جگہ بڑے بڑے آدمی کنفیوٹیش کے شاگرد ہو جاتے تھے مگر مفلسی اسے نہیں چھوڑتی تھی۔ اور لوگ اسے بہت تنگ کرتے تھے۔ کنفیوٹیش نے جب یہ دیکھا کہ تلقین اور فہمائش کا مال بجز خطرہ جان اور لوگوں

کی دشمنی کے کچھ نہیں نکلتا۔ تو ناچار اپنے وطن کو واپس آ گیا۔ اور یہاں پہنچ کر اپنے شاگردوں کی مدد سے وہ مشہور کتابیں تصنیف اور تالیف کیں جن کو چین والے اب تک نہایت مقدس اور متبرک مانتے ہیں۔ کنفیوٹیش کی عمر شتر برس کی ہوئی تو اس کا ایک شاگرد جسے وہ نہایت عزیز رکھتا تھا مر گیا۔ کنفیوٹیش کو اس سے یہ توقع تھی کہ ”میرے بعد میرے سائل کو جہان میں پھیلایگا۔“ اس لئے اس کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ بے اختیار رونے لگا اور فرط حسرت میں اس کی زبان سے نکل گیا۔ کہ ”خدا نے مجھے ٹوٹ لیا۔“ تھوڑے روز اپنی وفات سے پہلے جب اس کی عمر نوے برس کی تھی وہ ایک روز لاٹھی کے سہارے ٹھلتا ہوا آہ سرد بھر کر کہنے لگا۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتا ہے۔ مضبوط شہتیر جھکا جاتا ہے۔ اور حکیم پودے کی طرح کھلایا جاتا ہے۔“ پھر اس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ”میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور وہ میری موت کی خبر دیتا ہے۔“ چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی وہ سات روز تک بیہوش پڑا رہا۔ اور ۷۷۹ برس قبل مسیح ۴ اس جہان سے انتقال کر گیا۔ مرنے کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کی آنکھیں بند کیں۔ اور زمین چنگی چاول اس کے مُنہ میں ڈال کر اس کو وزیروں کا سا لباس پہنایا۔ پھر اس کی لاش کو ان تمام رسموں

کے موافق جن کا وہ خود اپنی زندگی میں بڑا پابند تھا۔ شہر کے باہر ایک قطعہ زمین میں جو خاص اسی غرض سے خریدا گیا تھا۔ دفن کر دیا۔ اور نشانی کے لئے وہاں تین ڈھیریاں مٹی کی لگا دیں۔ اور ایک درخت بو دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ درخت آج تک موجود ہے۔ اس کے ایک شاگرد نے چھ برس تک اس کا سوگ رکھا اور اس غرضہ میں کنفیوشیس کے مدفن پر ایک گاؤں آباد ہو گیا۔ جو آجکل ایک بڑا

قصبہ ہے + اگرچہ کنفیوشیس کی زندگی میں کسی نے اس کی بات نہ مانی اور سب بُرائی میں مبتلا رہے۔ لیکن اس کے مرتے ہی ہر جنس کے لوگ اس کی تعظیم کرنے لگے۔ تو کے بادشاہ کو جس وقت اس کے مرنے کی خبر پہنچی وہ رو پڑا اور کہنے لگا۔ کہ ”آج میری سلطنت کا نہایت بیش قیمت خزانہ مجھ سے چھن گیا۔ یہی حال اور رئیسوں کا ہوا۔ اور سب آدمی اس کو ولی سمجھنے لگے۔ بادشاہ نے اس کا لقب **ملک المعلمین** رکھا۔ خاندان منگ نے جو مغلوں کے بعد چین کے بادشاہ ہوئے۔ اسے ”اگلے زمانے کا معلم اقدس“ کہا۔ چنانچہ آج تک چین کے تاتاری حکام اس کو اس لقب سے یاد کرتے ہیں +

کنفیوشیس کی اولاد میں صرف اس کا ایک پوتا

باقی رہا تھا۔ اس کی اولاد سے ۶۷ یا ۶۸ پشتیں آج تک اس کے ملک میں گزر چکی ہیں اور اس کے خاندان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اس گھرانے کے بڑے بڑے امارت کے منصب پر سرفراز کئے جاتے ہیں *
 چین کے ہر ایک شہر میں کنفیوٹیش کے نام کا ایک ایک مندر بنا ہوا ہے۔ جس کے اندر اس کا بت یا اس کے نام کی تختیاں جن کے حروف ماتھ ماتھ بھر لیے ہوتے ہیں۔ رکھی ہیں۔ اور اُن کے گرد اُس کے شاگردوں کے بت ہیں جن کو چین کے نوگ دلی مانتے ہیں۔ ہر مہینے کے پورناشی اور دوج کے دن تمام قاضی جمع ہو کر مندر میں جاتے ہیں اور سر جھکا کر اور گھٹنے ٹیک کر سجدہ کرتے اور بُان جلاتے ہیں۔ اس کی سالگرہ کے دن کھانا اس کی نذر چڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اُس سے کسی شے کے طالب نہیں ہوتے اور نہ دُعا مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چین میں اس کے نام کے ۱۵۶۰ مندر ہیں جن میں ہر سال باسٹھ ہزار خنزیر اور خرگوش قربانی کئے جاتے ہیں۔ بعض مصنف یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا بت کسی مندر میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف نام کی تختیاں رکھی ہوئی ہیں *


گوتم بدھ

سری کرشن کے زمانہ سے ایک ہزار سال بعد اور ولادت مسیحؑ سے پانسو برس قبل ہندوستان میں خلق خدا کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے مہاتما ”گوتم بدھ“ کا ظہور ہوا۔ جن کو دُنیا نے اعلیٰ درجہ کا فیلسوف و حکیم اور اہل ہند نے دینی پیشوا تسلیم کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو روحانی حکیم کہنا اور دینی رہنما ماننا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیم زیادہ تر روح کی اصلاح اور تقویت پر مبنی ہے۔

نام و نسب :- سدھارتھ گوتم بدھ نام و لقب، راجہ ”سدھادن“ فرمانروائے قوم شاکیہ کے نور نظر۔ اور خاندان ”گوتم“ کے ذی عزت شہزادے تھے۔ بلکہ باپ کی اکلوتی اور بہت بڑی آرزوں سے حاصل شدہ اولاد ہونے کے سبب آئندہ حکمران اور مالک تاج و تخت ہونے والے۔

ولادت :- ”گوتم بدھ“ حضرت مسیحؑ سے تقریباً پانچ سو برس پہلے۔ شہر ”کپیل وستو“ میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر دریائے ”روہنی“ کے کنارے شہر ”بنارس“ سے سو میل کے فاصلے پر شمال و مشرق کے گوشہ میں واقع تھا۔ اس جگہ سے ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں اگرچہ دور تھیں لیکن صاف دکھائی پڑتی تھیں۔ شہر

”کپل وستو“ کے ارد گرد کی پہاڑیوں سے بہت سی
 ندیاں نکل کر مختلف سمتوں میں اپنی روانی دکھاتی اور
 شہر مذکور اور اس کے علاقہ کو سیراب و زر خیز بناتی
 تھیں +

”بُدھ کا باپ راجہ ”سدھادن“ قریب پینتالیس سال
 کے عمر پا چکا تھا۔ لیکن اس کے دل کا کنول کسی
 اولاد کے نہ ہونے سے مڑھایا رہتا تھا۔ جب اس کو
 خبر ملی کہ اس کی بڑی ملکہ حاملہ ہوئی ہے وہ فرط
 مسرت سے باغ باغ ہو گیا۔ اور بہت کچھ خیرات
 کی۔ حاملہ ملکہ ملکی رواج کے موافق اپنے ماں باپ
 کے گھر روانہ کی گئی۔ تاکہ بچہ وہیں پیدا ہو۔ لیکن
 لڑکا راستے ہی میں بعض بلند اور گھنے درختوں کے
 تلے پیدا ہو گیا۔ اس واسطے زچہ و بچہ کو شہر
 ”کپل وستو“ میں واپس لائے۔ یہاں آنے کے ایک
 ہی ہفتہ کے اندر حقیقی ماں فوت ہو گئی۔ اور بچہ
 کی پرورش سوتیلی ماں نے اپنی اولاد بنا کر کی۔ اور
 ”سدھارتھ“ نام رکھا +

تعلیم و تربیت :- بُدھ کی تعلیم و تربیت ابتدا
 سے ایک شہزادے کی طرح ہوئی اس لئے گو ہم کو ان
 کے بچپن کا حال معتبر کتابوں میں نہیں ملتا پھر بھی
 ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضرورت وقت اور رواج ملک کے
 موافق بُدھ کو تمام نہیں تو اکثر ضروری علوم پڑھائے
 گئے ہونگے۔ اور آداب سلطنت وغیرہ کی بھی تعلیم دی

گئی ہوگی۔ چنانچہ ایک مرتبہ راجہ ”سداھن“ سے چند اہل دربار نے ولیعہد بہادر کی یہ شکایت کی کہ ان کو مردانہ کھیلوں اور جنگی کرتبوں سے دل چسپی نہیں۔ حالانکہ ایک شہزادہ کو ان کا جاننا لازمی ہے۔ شہزادہ کو بھی اس بات کی سن گئی لگ گئی۔ اور اس نے نیزہ بازی کے میدان میں سپہ گری کے ہنر ظاہر کر کے شکایت کرنے والوں کے منہ میں خاک ڈال دی +

طلب علم کا شوق :- گوتھ بدھ کے زندگی کے حالات اُنٹیس برس کی عمر تک بالکل نامعلوم ہیں۔ اس کے بعد ایک معمولی سے واقعہ کو دیکھ کر ان کو پربہیزگاری اور گوشہ نشینی کا شوق پیدا ہو گیا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ اپنے دادا دار خاوم ”پین“ کے ساتھ سیر اور دُنیا کے تغیرات کا نظارہ کرنے کے لئے نکلے۔ پہلے ایک بڑھا بلا جس کو درازئی عمر نے فرسودہ حال بنا رکھا تھا۔ اس کے بعد ایک کمزور اور پریشاں سال مرہن نظر آیا۔ وہ کمزوری کے باعث چل نہیں سکتا تھا۔ اور آگے بڑھے تو ایک خردسے کا جنازہ چار آدمیوں کے کاندھے پر جاتے دیکھا۔ بڑھاپے۔ مرض۔ اور موت کے رنگ دیکھ کر بدھ کی سدھ بے سرچہکی تھی۔ ان کا دل اس بات سے متاثر ہو گیا تھا۔ اور وہ خیال کر رہے تھے کہ ان ہی غنیمتوں سے ان کو بھی سنا کرنا ہے۔ دُنیا کی بے ثباتی اور انسان کی زندگی کا فانی ہونا ان کے ضمیر پر واضح ہو گیا تھا۔

اب اور آگے چل کر ایک صاحبِ دل درویش نظر آئے۔ جن کے چہرے پر وقار اور بزرگی کے ساتھ دلی اطمینان کے آثار موجود تھے +

گوتم بدھ کو خیال آیا کہ دُنیا کے جھگڑے اطمینانِ خاطر کے حصول میں سدّ راہ ہوتے ہیں۔ اور یادِ الٰہی کے لئے تعلقات کا ترک کرنا ہی سچی دل جمعی کا ذریعہ ہے۔ یہ تصور دماغ میں لے کر وہ گھر میں واپس آئے۔ دل میں کہتے تھے۔ ع

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

گوتم کی شادی ہو چکی تھی۔ جسوہارا ان کی بیوی حسن و جمال اور نسوانی خوبیوں میں بے مثال تھی۔ اس سے ایک فرزندِ نرینہ بھی ہو گیا تھا۔ رطکے کا ”راہل“ نام تھا۔ مگر اُنہوں نے ان سب تعلقات کی زنجیریں ٹٹا کر۔ آدھی رات کے وقت۔ اپنے خاص خدمتگار ”چین“ سے اپنی سواری کا گھوڑا منگوایا۔ نوکر تو اس حکم کی تعمیل کرنے گیا۔ اور گوتم اپنی زوجہ کی خوابگاہ کی طرف بڑھے کمرے کی چوکھٹ پر استادہ ہو کر دیکھا کہ پیاری بی بی عزیزِ نخت جگر کے سر پر ہاتھ رکھے محو خواب ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں زوجہ کی آنکھ نہ کھل جائے بچے کو پیار بھی نہ کیا۔ اور بی بی بچہ۔ ماں باپ۔ اور سلطنت و دولت سب کو نیاک کر محل سے نکل آئے۔ ”چین“ گھوڑا لئے ہوئے دروازہ قصر پر منتظر تھا۔ سوار ہو کر چل نکلے۔ جب بہت دور

نکل گئے۔ اور دریائے "ایومہ" کا کنارہ آ گیا۔ "چین" کو وہاں اپنے قیمتی جواہرات اوسے کر "کیل دستو" واپس جانے کا حکم دیا۔ "چین" نے زہد و ریاضت کے لئے ساتھ چلنے کی آرزو کی۔ مگر اُس کو ہمراہ نہ لیا اور کہا۔ "اگر تم کیل دستو نہ جاؤ گے تو باباجان کو میرا حال کس سے معلوم ہوگا۔ تم اُن سے میرا ماجرا کہنا۔ اور خوش رہنا۔ غرض اس کو بڑی مہربانی سے رخصت کیا اور خود وریا کو عبور کر کے بھدرا کرایا۔ یعنی سر۔ ڈاڑھی۔ مونچھ۔ اور ابرو سب کو مُنڈا ڈالا۔ اور ایک غریب کسان سے لباس کا تبادلہ کر کے فقیری اختیار کرنے کے لئے "راج گری" کی طرف روانہ ہو گئے *
 "راج گری" گندھ کی حکومت کا حاکم نشین شہر اور پُر فضا وادی کے اندر پانچ پہاڑیوں کے حلقہ میں واقع تھا۔ پہاڑوں کے غار بعض مشہور گوشہ نشین درویشوں کے مسکن تھے۔ گوتم ان کے پاس گئے۔ اور ایک درویش کے مرید ہوئے۔ اس کا نام "الز" تھا۔ لیکن اس کی تعلیم سے ان کا دل نہ ٹھیرا تو دوسرے خدا پرست بزرگ سے رجوع لائے۔ اس کو "اورک" کہا جاتا تھا۔ اور "گوتم" نے ان دونوں کا ملین سے ہندو مذہب۔ اور ہندوستان کے حکما کا فلسفہ مکمل طور پر تحصیل کیا *
 تحصیل علم سے فارغ ہو کر "گوتم" کا دل جوگ اور جپ تپ کی طرف مائل ہوا۔ وہ ایک جنگل میں

گئے۔ اس کا نام ”اورویل“ تھا۔ اور اب یہ ”مبدھ گیا“ کہلاتا ہے۔ ”گوتم“ اس جگہ چھ برس تک نفس کشی کی محنتوں میں مصروف رہے۔ ریاضت کے باعث آخر کار بدن سوکھ کے کاٹھا ہو گیا۔ مگر افسوس کہ جو آرزو تھی وہ یوں نہ حاصل ہوئی۔ حقیقی اطمینان اور سچی خوشی کی منزل ہنوز اتنی ہی دور تھی جس قدر فقر و جوگ اختیار کرنے اور گھر بار تیا گئے سے پہلے۔ اس ان عبادتوں نے اتنا اثر دکھایا کہ نام کی شہرت ہوئی اور دور و نزدیک کے چند مرید اُن کے گرد فراہم ہو گئے۔

ایک دن ”گوتم“ کو چند قدم چلنا پڑا۔ منعفت کا یہ عالم تھا کہ قدم اٹھانا دشوار تھا ابھی کچھ دور نہ گئے تھے کہ پیر لڑکھڑایا۔ گر پڑے۔ اور بیہوش ہو گئے۔ مرید تو سمجھے کہ پیر صاحب جاں بحق ہو گئے۔ لیکن کچھ دیر میں ”گوتم“ نے آنکھ کھول دی۔ سنبھل بیٹھے۔ اور اُنہوں نے دیکھا کہ یہ سخت پابندیاں کوئی نفع نہیں رکھتیں تو نفس کشی سے ہاتھ اٹھا لیا۔

مرید پیر کی طبیعت کا یہ پلٹا دیکھ کر انہیں راہ راست سے منحرف سمجھے۔ اور ان کی رفاقت ترک کر کے ”بنارس“ چل دیئے۔ گوتم جنگل کی جھاڑوں میں سراسیمہ پڑے پھرتے تھے۔ دل کی تسکین کا سُر اُن کو دید۔ شاستر۔ فلسفہ و حکمت۔ زہر و ریاضت کسی میں نہ ملا تھا۔ حیران تھے کہ کیا کویں اور کہاں ڈھونڈیں۔ اس میں تو شک نہ تھا کہ سچی راحت دُنیا

میں ضرور تھی۔ مگر یہ اُس کی طرف راہ نہیں پاتے تھے اور بھٹکتے پھر رہے تھے۔ دل بے قابو تھا۔ کبھی جنگل میں نکل جاتے تو کسی دقت بستی کے آس پاس آ جاتے۔ بھوک کی تکلیف محسوس ہوتی۔ تو کم ہمتی کہتی کہ چل اپنے گھر چل اور سلطنت و دولت پر لات نہ مار۔

گوتم اسی ادھیڑ میں تھا کہ ان کو ایک کنواری کسان کی لڑکی نے دیکھا وہ سمجھی کہ فقیر پریشان و بے اطمینان ہے۔ خلقی مہربانی کے تقاضا سے ان کے پاس آئی اور مرحمت کے لہجہ میں کہا:-

”مہاراج! کیا آپ کو بھوک نے وق کیا ہے؟“
 ”مہکم ہو تو روکھی سوکھی جو میسر ہے حاضر کروں؟“
 ”گوتم نے سر اٹھا کر غصہ دیا اس لڑکی کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا:-“ہن تمہارا نام کیا ہے؟“
 لڑکی:- ”مہاراج! مجھے لوگ ”سوجات“ کہتے ہیں۔“
 ”گوتم:-“ہاں مجھے بھوک تو ہے! اور سخت۔ لیکن کیا تمہاری تواضع سے میری بھوک مٹ سکتی ہے۔ ہن! یہ سوال کٹھن ہے؟“

معصوم کسان کی لڑکی اس رمز کو کیا سمجھتی۔ وہ کیا جان سکتی تھی کہ گوتم کے خیالات کیا ہیں۔ بہر حال اس نے کھانے کی چیزیں لاکر ان کے روبرو رکھ دیں۔ اور التجا کی کہ ”مہاراج! کچھ تناول فرمائیں؟“
 ”گوتم (مسکرا کر):-“میری مہربان سوجات! کیا ان

چیزوں سے میری جھوک ٹھہر جائیگی؟
 لڑکی ”مہاراج! ہاں یہ آپ کی آسودگی کا سبب بن
 سکتی ہیں“

گوتم ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا تناول کرنے
 لگے۔ یہ درخت اسی دن سے ”شجر دانش“ کہلایا۔ سوچات
 تو کھانا کھلا کر چلی گئی۔ مگر یہ پیڑ کے نیچے دن بھر
 بیٹھے اپنے سوچ بچار میں ڈوبے رہے۔ معلوم نہیں
 کیا کیا خیالات ان کے دل و دماغ میں پیچیدہ ہوئے۔
 صبح سویرے سے شام پڑنے تک وہ اسی درخت کے
 تلے بیٹھے رہے۔ اور شام کے قریب ان کی جھوک
 فی الواقع دُور ہو گئی۔ ان پر پوشیدہ بھید کھل گئے۔
 سچا اطمینان حاصل اور ہمشت کا راستہ مل گیا۔ وہ بدھ
 کے درجہ پر پہنچ گئے۔ اور یہ بات قابل غور ہے
 کہ ”دوارکا“ کے تاجدار نے جس نور سے بلند درخت
 کے زیر سایہ دُنیا کو محروم کیا۔ وہی نور اب ایک ہزار
 برس کے بعد اُسی بلند درخت کے سایہ تلے ”گوتم بدھ“
 کے جسم میں جلوہ گر ہوا۔ یعنی بدھ نے رہنمائی مخلوق
 کے لئے غیبی شعل ہدایت سے اپنا چراغ علم روشن
 بنایا۔

گوتم خوشی میں گمن ہو کر اُٹھے اور ”راج گری“
 کی پہاڑیوں کی طرف گئے۔ وہاں ان کو اپنے پُرانے
 اُستادوں کی وفات کا حال معلوم ہوا تو وہ اب سیدھے
 بنارس کے عازم ہوئے۔ راستہ میں ان کے ایک قدیم

دوست ”اپن“ نامی ملے۔ ایک۔ نہ ”گوتم“ کی صورت دیکھ کر کہا۔ تم تو اب بالکل تندرست و توانا ہو گئے ہو۔ صورت سے اطمینان اور دلی خوشی کے آثار نمایاں ہیں۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ کس طریقت نے تم کو اتنا بشاش بنا دیا ہے؟

گوتم۔ ”آپ سچ کہتے ہیں۔ دُنیا کی جلد روحانی اور اخلاقی طاقتوں کی کتنی میرے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ میں نے نفسِ امارہ کو مغلوب اور ہمیشہ کی آسائش کا راستہ دریافت کر لیا ہے۔“ ایک۔ ”اب پھر کہاں چلے؟“ گوتم۔ ”بنارس۔“ ایک۔ ”کیوں“ گوتم نے کہا۔ ”انسانوں کو قدرت کے مخفی راز جتنا کر سچی خدا شناسی اور حقیقت بینی کا راستہ دکھانا میرا مقصد ہے۔ اور بنارس اس منادی کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔ میں اُن دینی اصول کو جو جہل و نادانی کی تاریکی میں چھپ گئے ہیں اہل عالم پر واضح اور نمایاں کرونگا۔ اور فانی جہان کے رہنے والوں کو ابدی زندگی کا مالک بناؤنگا۔“

ایک تو اس بیان کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر اپنی راہ گیا۔ اور ”گوتم بدھ“ اس کی بے اعتنائی کا خیال کئے بغیر چند روز بعد بنارس کے قریب ”ہرن بن“ میں جا پہنچے۔

”ہرن بن“ میں ان کے پانچ قدیم مرید رہتے تھے۔ وہ ان کے نرک ریاضت کے بعد سے ان سے مخوف

ہو گئے تھے۔ اب جو بلے تو بڑی سرد مہری سے
 ہمیش آئے۔ عزت و تنظیم کچھ نہ کی۔ خاطر و مدارات
 سے بھی سرد کار نہ رکھا۔ بَدھ ان سے کہنے لگے۔
 ”میں بَدھ ہو گیا ہوں اور نجات کا راستہ میں نے
 معلوم کر لیا ہے۔ تمہیں بھی وہ ترکیبیں بتا سکتا
 ہوں جو انسانی زندگی کی تکالیف سے بچا سکیں گی۔“ الفرض
 ان سے دیر تک مباحثہ ہوا کیا۔ اور اخیر میں بدھ کی
 کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا عمر رسیدہ سابق مرید
 ”گندنیا“ ان پر ایمان لے آیا۔ پھر باقی مریدوں نے
 بھی ان کا طریق نجات اختیار کر لیا۔

گوتم بدھ تھوڑے عرصے تک اسی جنگل میں رہے۔
 امیر۔ غریب۔ مرد۔ عورت۔ بچے اور بڑے سب کو وہ
 ایکساں فیض بخشتے تھے۔ شروع میں دُنیا دار اشخاص
 ہی ان کے زیادہ مرید ہوئے۔ ان میں دو عورتیں
 بھی تھیں۔ یاس نامی ایک بڑا دولت مند نوجوان ان
 کا پہلا دُنیا دار چیلہ ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ
 ایک چھوٹی سی جماعت بھی تھی۔ اس کے ماں باپ
 اور اس کی بی بی بھی بُرہ مت میں شامل ہوئی۔ لیکن
 یہ سب دُنیا دار مرید تھے۔

گوتم بَدھ نے درخت دانش کے زیر سایہ فیض یاب
 ہونے کے پانچ اور ”ہرن بن“ میں آنے کے تین
 مہینے بعد اپنے ساٹھ مریدوں کو متعدد اطراٹ میں
 وعظ و ہدایت کے لئے ارسال کیا فقط ایک ”یاس“

بنارس میں اپنے گھر رہ گیا۔ اور گوتم یہ انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں وہ مرید کیا کر کے آتے ہیں پھر گوتم "اروبل" کے جنگل میں گئے۔ یہاں تین نامور گوشہ نشین اور فلسفی بھائی تابعلموں کی کثیر جماعت کے ساتھ رہتے تھے۔ گوتم بھی ان کے پاس جا کر ٹھہرے۔ اور تھوڑے دنوں میں ایک بھائی کو اپنا پیلا کر لیا۔ نئے مرید کے دوسرے بھائی اور ان کے طلبہ بھی جلد ہی بدھ کی تعلیمات کے ماننے والوں میں شامل ہو گئے۔ اور اس واقعہ کے باعث ملک میں بدھ کی شہرت ایسی پھیلی کہ سینکڑوں آدمی دور دور سے جوق جوق انہیں دیکھنے کے واسطے آنے لگے۔ گوتم کو زمین وسیع مل گئی۔ ان کے وعظ کا حلقہ بڑھا۔ اور مریدوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

اروبل کے جنگل سے وہ مریدوں کا انبوه ساتھ لیکر راج گری کے شہر میں آئے اور یہاں کا راجہ بڑے اعزاز و اکرام سے ان کا میزبان بنا۔ وہ ان کا مرید بھی ہو گیا۔ اس راجہ کا نام "مبھاسر" تھا۔ اس کی وجہ سے اور بھی بہت سے آدمی بدھ کی تعلیم قبول کر کے ان کے مقلد بنے۔ بدھ شہر کے قریب "ویلیون" کی ایک جھاڑی میں رہنے لگے۔ یہاں انہوں نے کئی سال بسر کئے اور اس عرصہ میں اپنے عقاید کی سنادی کرتے رہے۔ اور بہت سے مضامین پر مباحثے بھی کئے۔

گوتم بدھ کے ساتھ لوگوں کا جوش عقیدت بہت جلد فرو بھی ہو گیا۔ ان کے مُریدوں کو بھیک دینگے ہوئے کھاتیوں اور پد سلوکیوں کا دان ملتا۔ اس بات سے وہ پریشان ہونے لگے لیکن صبر و سکون کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتے تھے۔ اسی اثنا میں گوتم کے باپ نے اُن کو طلب کیا۔ اور لکھا کہ اخیر وقت میں ایک بار اپنا دیدار تو دے جاؤ۔ گوتم ”کیل دستو“ گئے۔ اور شہر سے باہر مع مُریدوں کے ایک جھاڑی میں ٹھہرے۔ ان کے باپ عزیزوں کو لے کر ملنے آئے۔ لیکن بیٹے کی حالت دیکھ کر ایسے ناخوش ہوئے کہ مہمان نوازی بھی نہ کی۔ گوتم نے وہ دن یونہی کاٹا۔ دوسرے دن شہر میں بھیک مانگنا شروع کیا۔ اُن کے باپ کو یہ خبر ملی تو وہ خود اس حرکت سے منع کرنے کے لئے گوتم کے پاس آیا۔ اور گوتم نے اُس کو اپنے عقیدے کا وعظ سنایا۔ مگر ان کا باپ بغیر اس کے کہ گوتم کی باتوں کا کچھ جواب دے۔ بھولی کو اُن سے چھین کر انہیں اپنے ساتھ راج محل میں لے گیا۔

محل میں ان کی بڑی عزت و خاطر ہوئی۔ لیکن گوتم کی بی بی ان کے پاس نہ آئی۔ اس نے کہا کہ ”میری ان کے دل میں کچھ بھی جگہ ہوگی تو وہ خود مجھے سرفراز کرینگے۔“ گوتم کے ترک دنیا کرنے کے وقت سے یہ دُکھیاری عورت بھی عیش و آرام کو تھج چُکی تھی۔ ایک دفعہ دن بھر میں معمولی غذا

کھاتی - اور چٹائی پر سوتی تھی - گوتم کو کپیل دستو
 میں آتے مہنی یہ خبریں بل چکی تھیں - لہذا اگرچہ
 ان کے مت میں عورت کو چھونا یا اپنے بدن
 سے اس کا ہاتھ لگنے دینا حرام تھا - لیکن گوتم دو
 مریدوں کے ساتھ اپنی زوجہ کے پاس گئے -
 ”جسودھارا“ ان کی بی بی گوتم کو جوگیوں کے لباس
 میں دیکھ کر ان کے قدموں پہ گر پڑی اور آنسوؤں
 کی جھڑی برسانے لگی - گوتم کو اس پر رحم آ گیا -
 اور انہوں نے اپنے مذہب کے حلقہ میں ایک شاخ
 عورتوں کے لئے بھی قائم کر دی - اور اس گروہ کی
 پہلی گوشہ نشین بیراگن گوتم کی زوجہ ”جسودھارا“ بنی
 جسودھارا نے اپنے نور نظر ”راہل“ کو گوتم کی
 صورت دکھا کر بتا دیا تھا کہ یہ تیرے باپ ہیں اور
 تو ان سے اپنا ورثہ طلب کر - ”راہل“ گوتم کے پیچھے
 پڑ گیا اور جب اس کا اصرار حد سے بڑھا تو گوتم نے
 اپنے مریدین سے کہا - ”براہران ! درخت دانش کے
 نیچے جو دولت عظیمہ مجھ کو ملی ہے وہ میں اس رٹکے
 کو دیتا ہوں - تم اس کو میرا خلیفہ اور وارث تسلیم کرو -
 چنانچہ ”راہل“ گروہ میں شامل کر لیا گیا - اور ”کپیل دستو“
 کے بوڑھے راجہ کے لئے بیٹے کے ساتھ پوتے کا بھی
 ہاتھ سے جانا سواں روح بن گیا - گوتم پندرہ دن
 کپیل دستو میں رہ کر وہاں سے راج گری کی طرف
 واپس چلے - بہت سے ہموطن - اور عزیز و اقارب ان

کے گروہ میں داخل ہو کر ساتھ ہو گئے راستہ میں
بُڈھ ایک دریا کے کنارے چند روز مقیم رہے اور
وہاں سے اپنے قدیم وفادار خادم ”چین“ کو رخصت
کیا۔ اور خود آگے روانہ ہوئے ۔

چار شخص گوتم بُڈھ کے ہموطن مریدوں میں خاص
طور پر ذکر کے لائق ہیں ۔ اندا ۔ اور دیوت ۔ یہ
دو ان کے رشتہ دار بھائی تھے ۔ اور ”اپالی“ حجام ۔
اور ”انروہ“ یہ بھی ان کے ہموطن تھے ۔ اپالی
بُڈھ مت کا مشہور پیشوا ہوا ہے ۔ انروہ اس دین
کی حکمت نظریہ کا زبردست عالم تھا ۔ اند نے عمر
بھر گوتم بُڈھ کی رفاقت کی ۔ اور دیوت ان کا حریف
بن کر ایک جداگانہ طریقہ کا بانی ہوا ۔

بُڈھ راجگری پہنچے ۔ برسات کا موسم وہاں بسر
کر کے مقام ”سراستی“ کو گئے ۔ یہ ”کوسل“ کی سلطنت
کا پایہ تخت تھا ۔ یہاں ایک دولت مند سوداگر ان کا
مینہ بان بنا ۔ اور ایک وسیع جنگل خوب سرسبز و شاداب
ان کے رہنے کے واسطے خاص کر دیا ۔ یہ جنگل بُڈھ
کے یہاں کئی برسات کے موسم بسر کرنے کے سبب
انہی کی طرف منسوب ہوا ۔ اس جگہ انہوں نے کئی
بڑے بڑے مکالمے اور مباحثے کئے تھے ۔ اور یہاں
ان کی ہدایت آمیز زندگی کا تیسرا سال ختم ہوا ۔
بُڈھ کی ہدایت و ارشاد کی زندگی میں چوتھے
سال سے چوالیسویں برس تک جو اہم واقعات پیش

آئے ان کا مفصل تذکرہ نہ تو کسی تاریخ میں ملتا ہے اور نہ اس کے بیان کرنے کی ہنس مختصر میں گنجائش ہے۔ اس لئے جتنے اجالی حالات پلٹے گئے ہیں ان کا بہت ہی اختصار کے ساتھ یہاں درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں :-

ان چالیس سال میں ”بدھ“ نے غالباً اپنے طریقہ کی اشاعت - اپنے گروہ کا قانون معاشرت و مذہب بنانے - اپنے فلسفہ کو پختہ اور محکم کرنے - اور اپنے دُنیا وار مریدوں کو پاکیزگی و پاک باطنی کی نصیحت و ہدایت کرنے کے مہتم بالشان کام انجام دئے۔ ”مہابن“ میں ایک ”نٹ“ کو اپنا مرید بنایا - باپ کے آخری دیدار کے لئے پھر ”کپل و سنو“ گئے - اور جب ان کا ضعیف العمر باپ مر گیا تو اس کی لاش آگ کی مندر کر کے ”مہابن“ میں پلٹ آئے - اس سفر میں سوتیلی ماں - بیوی - اور چند دیگر عورتیں ان کے ساتھ آئیں - اور بڑی التجا کے بعد سلسلہ میں ملا لی گئیں - راجگری کی رانی چھما کا ان کے گروہ میں داخل ہوئی - ایک مرید کو اس موقع پر معجزہ نمائی سے منع کیا - اور ساتویں سال میں ایک بدکار عورت ”چنچا“ نامی مخالفوں کے اغوا سے بدھ کو بدنام کرنے پر آمادہ ہوئی لیکن اس کی قلعی کھل گئی اور وہ ناکام رہی - نویں برس ان کے طریقہ کی جماعتوں میں باہمی فساد اور خانہ جنگی پھیل گئی - جب گوتم کی کوششیں اس فتنہ کو فرو کرنے

میں کارگر نہ ہوسکیں تو وہ مریدوں سے الگ ہو کر اکیلے ”پاریاک“ کے جنگل کو چلے گئے اور یہاں کے پڑوسی دھقانوں نے ان کے لئے ایک جھونپڑا بنا دیا۔ برسات اسی میں کاٹی اس کے بعد ان کے نافرمان مرید انہیں تلاش کرتے ہوئے آئے اور اپنی خطا کی معافی چاہی۔ گوتم نے ان کا قصور بخش دیا۔ اور ان سے مہربانی کا برتاؤ کیا۔ پھر ان کے ساتھ ”سراستی“ ہوتے ہوئے راجگری کو گئے۔ اپنے بیٹے ”راہل“ اور چچا زاد بھائی ”موہنم“ فرمانروائے کپل وستو کو وعظ سنایا۔ ایک شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے ہرن کو دوب کھلا کر اور شکاری کو بحالت غیظ و غضب نصیحت کر کے نجات کا سیدھا راستہ دکھایا۔ کہنوں تو وہ شکاری ان کی جان لینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اور کجا ان کا مرید بن گیا۔ چلیا کے جنگل میں ”انگولی مل“ ڈاکو سے ایسا شفقت آمیز برتاؤ کیا کہ وہ ان کا شیفتہ ہو کر اپنے ظالمانہ فعل سے تائب ہو گیا۔ الغرض اس مدت کی باتیں سب یہی بتاتی ہیں کہ گوتم نے یہ زمانہ خلق کو راہ راست دکھانے اور انہیں خدا شناس بنانے میں صرف کیا تھا ۴

گوتم بدھ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ نیک و بد۔ حسین و بد صورت۔ شریف و رذیل ہر طبقہ اور ہر درجہ کی عورتیں ان کی نگاہ میں برابر تھیں۔ بلکہ بد چلن عورتوں پر زیادہ مہربانی کرتے۔ ان کے

یہاں دعوت کھاتے اور اس وجہ سے معتز آدمی اُن سے بدظن ہو جاتے تو اس کی پروا نہ کرتے۔ عورتوں نے ان کے فرقہ کی امداد میں اپنا مال و جان تک وقف کر دیا تھا۔ ”سراستی“ کی ایک عورت ”بشا کا“ نامی اس بارہ میں سب پر بڑھ گئی تھی۔ اس نے اہل فرقہ کے لئے ایک سایہ دار کنبج وقف کیا اور سراستی کے مشرق میں ایک خانقاہ بھی بنوا دی تھی۔

گوتم کا عورتوں کی اس قدر عزت کرنا شاید اس وجہ سے ہو کہ معصوم کسان لڑکی ”سوجات“ کی دعوت جس کے بعد انہیں معرفت کا بلند رتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ انہیں بھولی نہ تھی۔ اور وہ عورت کی اس پاک سفت یعنی رحم دلی اور ہمدردی کے بیحد قائل ہو گئے تھے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کا مقصد انسانوں کو پاک اعمال کا پابند بنانا اور نجات ابدی کا سیدھا راستہ دکھانا تھا۔ اُس کے متعلق دو مفید و دلچسپ روایتیں باختصار ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

(۱) ”کساگوتمی“ ایک جوان عورت اور دولت مند شخص کی بی بی تھی اس کا پہلوٹھا کسن بچہ فوت ہو گیا۔ ”کساگوتمی“ مردہ بچہ کو چھاتی سے لگائے پاک سیرت لوگوں سے اس کے لئے دوا دریافت کرتی پھرتی تھی۔ ایک عابد نے اسے گوتم بدھ کا پتا دیا۔ اور وہ ان کے پاس آئی اور انہوں نے دوا بتانے کا اقرار کیا تو ”گوتمی“ نے دوا کے اجزا دریافت کئے۔

گوتم نے اسے ہدایت کی کہ ایسے گھر سے جہاں کبھی کوئی موت نہ ہوئی ہنر تھوڑی سی "سرسوں" مانگ لائے۔ "گوتمی" بہت کچھ سرگردانی اٹھا کر خالی ہاتھ واپس آئی۔ اسے کوئی کنبہ اس قسم کا نہ ملا جس کا کوئی آدمی مرنا نہ ہو۔ "گوتمی" کے دل میں موت کا برحق ہونا جم گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ وہ مردہ بچہ کو جنگل میں ڈال کر خالی ہاتھ بدھ کے پاس آئی۔ اور پھر ان کی نصیحت سے موثر ہو کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئی۔

(۲) ایک متمول برہمن اپنے کھیت سے غلہ کی راس اٹھا کر گھر میں لایا۔ بدھ اپنی جھول لے کر اس سے بھیک مانگنے گئے۔ برہمن نے جھنجلا کر کہا۔ "میں جوڑتا۔ ہوتا۔ رکھوالی کرتا اور بہت کچھ محنت کے بعد غلہ گھر لاتا ہوں۔ تم بھی محنت سے روٹی کھاؤ۔ میرا سر نہ کھاؤ۔"

گوتم نے جواب دیا میں بھی مشقت کر کے روزی پیدا کرتا ہوں اور تخم ریزی سے غافل نہیں ہوتا۔ برہمن "تم اچھے کاشتکار ہو کہ اپنے کام کی نہ کوئی علامت رکھتے ہو اور نہ سامان۔"

گوتم۔ میرے پاس جملہ سامان موجود ہے۔ سنو! ایمان بیج ہے جس کو میں بوتا ہوں۔ نیک اعمال کی بارش سے وہ کھیتی سیراب ہوتی ہے۔ عقل اور حیا میرے ہل کے پُرزے ہیں۔ اور دل اس کا

ہلوا۔ میرے اس ہل کا دستہ قانونِ شریعت ہے۔
 شوق و مشانت میرا تازیانہ اور سعی و محنت دو بیل
 ہیں۔ یہ جوتائی غفلت اور مغالطہ کے خود رو پودوں
 کو فنا کر دیتی ہے۔ اور اس سے جو پھل پیدا
 ہوتے ہیں وہ نجات کے ابدی پھل ہیں۔ ان کو
 کھاتے ہی سب تکلیفیں دُور اور طبیعت مسرور
 ہو جاتی ہے۔

گوتم بُدھ کے چچا زاد بھائی دیودت نے اپنا
 جداگانہ پنہ اس لئے بنا لیا تھا کہ اس کی رائے
 میں بُدھ مت کے عابدوں کو جوگ اور نفس کشی لازمی
 تھی۔ اور بُدھ کہتے تھے کہ نہیں نجات کا راستہ اتنا
 آسان ہونا ضروری ہے کہ ہر طبیعت اور حالت کا آدمی
 اس پر چل سکے۔ کڑی پابندیاں آسانی پسندوں کو نہ
 بھائیگی اور انہیں ہدایت سے محروم رکھیں گی۔ بہر حال
 دیودت گوتم سے الگ ہو کر ان کا مد مقابل اور دشمن
 بن گیا۔ اور ”اجات ستر“ نامی ایک حکمران کو اپنا طرفدار
 بنا کر بدھ کی جان لینے کے درپے ہوا۔ مگر تین مرتبہ
 اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ دیودت کی موت نے
 اس کو تو بہت جلد بدھ کی دشمنی کے افکار سے چھڑا
 دیا۔ لیکن ”اجات ستر“ موجود تھا اور اپنے پیشوا کی
 نیابت کا حق ادا کرتا تھا۔ وہ ”سراوتی“ پر جو بدھ
 مت کا مرکز تھا۔ حملہ آور ہوا۔ اور کپل دستو کو بھی
 اس نے برباد کیا +

”سراوتی“ کو گوتم نے چوالیس برس اپنا صدر مقام رکھا۔ اور اس کے بعد وہ راجگری کو چلے آئے۔ یہاں واوی راجگری کی پانچ قدرتی محافظ پہاڑیوں میں سے ایک سب سے بلند چوٹی کے غار میں ٹھیرے۔ پھر اس جگہ سے ”امباہلی“ کو گئے اور راستہ میں دریائے گنگا کو عبور کیا۔ ان کا معبر اس مقام پر تھا۔ جہاں ”اجات سترو“ دشمن کی مدافعت کے لئے ایک نیا شہر اور قلعہ بناتا تھا۔ یہی شہر بعد میں گدھ سلطنت کا حاکم نشین شہر ہوا۔ اور ”پٹالی پتر“ کہلایا۔ اور اب آجکل اس کا نام ”پٹنہ“ ہے۔ گوتم ”امباہلی“ سے ”بیلوکنگ“ کو گئے۔ پینتالیسویں سال کی برسات یہیں کاٹی۔ اسی موسم میں وہ سخت بیمار ہوئے۔ اور مریدوں سے اپنے تین ماہ بعد دنیا سے رحلت کر جانے کی پیشینگوئی کی۔ پھر انہیں سمجھایا کہ ”درویشو! تم دھیان گیان میں ثابت قدم رہنا اپنے ارادوں کو پختہ اور نفس کی خواہشوں پر قابو رکھنا۔ اور ضبط کا دامن نہ چھوڑنا۔ اس قانون کی پابندی ہر شخص کو زندگی کی لا انتہا مصیبتوں سے محفوظ رکھیگی۔ اور اس بے پایاں سمندر سے ایمان کا بیڑا سلامت نکال کر کنارے لگا دیگی۔“

گوتم اس بیماری سے جلد تندرست ہو گئے۔ جسم میں سفر کی طاقت آئی تو ”کشتی نگر“ کی طرف چلے۔ راستہ میں بمقام ”پاوی“ چند انامی ایک منار نے

ان کی دعوت کی۔ سور کا گوشت اور چاول پکا کر کھلایا۔ گوتم دعوت کھا کے آگے بڑھے۔ مگر جب دریائے "کشت" کے کنارے پہنچے تکان اور پیاس نے بہت دق کیا۔ ٹھیرے کہ آرام لیں۔ اند سے پانی منگوا کر پیا۔ کچھ تسکین ہو گئی۔ پھر ندی میں نہائے۔ اور چند ٹھنڈے آرام لے کر سفر شروع کر دیا۔ "کشتی نگر" پہنچنے پر گوتم کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اور بیماری کا زور صاف بتانے لگا کہ یہ مرض الموت ہے۔ مریدوں میں چرچا تھا کہ چندا منار نے ایسا کھانا کھلانا جس سے ہمارے پیشوا بیمار ہو گئے۔ بدھ نے خیال کیا کہ ایسا نہ ہو میرے دُنیا سے گزر جانے کے بعد دُنیا کے آدمی چندا غریب کو نام رکھیں۔ یا وہ خود اپنے اس فعل پر ناوم ہو کہ اس نے کیوں کھانا کھلایا تھا۔ اس لئے انہوں نے اند کو ہدایت کی کہ جس وقت میرا رخت سفر دُنیا سے عالم آخرت کی طرف بندھ جائے۔ تم چندا سے جا کر کہنا۔ کہ "تمہیں گوتم مہاراج کو کھانا کھلانے کا اگلے جہان میں نیک بدلہ ملیگا" اور کہ دینا کہ یہ الفاظ خاص گوتم کی زبان کے ہیں" پھر کہا۔ "میں نے زندگی میں بہت سے آدمیوں کے یہاں دعوت کھائی ہے۔ مگر ان میں دو شخص خدا کی رحمت کا حصہ سب سے زیادہ پائیگے۔ ایک "سوجات" جس نے مجھے بدھ کا درجہ حاصل ہونے سے قبل درخت دانش کے نیچے کھانا کھلایا تھا۔ اور دوسرا چندا منار جس نے

میری وفات سے پہلے مجھے کھانا کھلایا نہ
گوتم ایک سایہ دار درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھ گئے۔
مریدوں کو دیر تک ایسے قواعد کی تعلیم دیتے رہے
جن کی پابندی گروہ کے لوگوں پر ان کی وفات کے
بعد فرض ہونے والی تھی۔ پھر اپنی تجویز و تکلفین کے
بارہ میں ہدایتیں کیں۔ اور انہ کو اپنا مخاطب بنایا۔
انہ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے بزرگ اور عزیز پیشوا
کی زندگی اب صرف ایک ہی دن اور ہے تو اس کا
دل غم کے بوجھ سے دب گیا۔ وہ الگ گوشہ تنہائی
میں جا کر رونے اور دل کی بھڑاس نکالنے میں مصروف
ہوا۔ لیکن گوتم نے اس کو پھر اپنے پاس بلایا اور
تسکین دے کر کہا: "انہ تم مدت سے میری صحبت
میں رہے اور میرے چال چلن کے تجربہ کار بنے
ہو۔ تم کو نروان حاصل ہونے کی توقع رکھنا لازم ہے۔
سچ کس بات کا ہے اور رونے کیوں ہو۔ یاد رکھو کہ
ہر جاندار یا بیجان کے لئے اپنی لازمی صفت یعنی فنا
سے علیحدہ ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ خدا نے یہ بات
انسان کی سرشت میں امانت رکھ دی ہے۔ وہ مٹیگا
اور ضرور مٹیگا۔ تم نے اپنے تئیں ہر طرح سعید ثابت
کیا ہے۔ سعادت کا دامن نہ چھوڑو۔ تم بھی جہالت
اور دنیاوی خواہشوں کے جال سے آزاد رہو گے۔"
پھر اور مریدوں سے انہ کی تعریف کرتے رہے +
گوتم کی حالت اب بہت خراب ہو چلی تھی۔ وہ ایک

ذراحت کے زیر سایہ پڑے تھے۔ پہلنے ڈلنے کی سکت نہ تھی۔ فرید خدمت کرتے اور آنکھوں میں رات کاٹتے رہے۔ آدھی رات کے وقت ایک فیلسوف برہمن مبدھ سے کچھ سوالات کرنے آیا۔ انند نے مقدس استاد کی تکلیف کے خیال سے برہمن کو روکا۔ مگر مبدھ نے آواز سن کر دریافت حال کیا۔ اور برہمن کو بلوایا اور سوالات سن کر اس سے کہا۔ ”بھائی! یہ وقت ایسے سوالات کا نہیں۔ میں مباحثہ نہیں کر سکتا۔ ہاں مذہبی وعظ سننا ہے تو سن لو!“ پھر کہا۔ ”نجات کے حصول کا ذریعہ پاکیزگی اور خدا ترسی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ طہارت کے آٹھ طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ پاکیزگی ہے اور آٹھواں خدا سے سچا عشق۔ ان کے اختیار کئے بغیر محال ہے کہ نجات مل سکے۔“

برہمن چلا گیا تو مبدھ نے انند سے کہا۔ ”شاید تم خیال کرتے ہو گے کہ ہمارے رہنا کی موت ہی ہمارے کام کا خاتمہ ہے! تم ہرگز اس بات کو دل میں جگہ بھی نہ دو اور میرے بعد ان ہدایتوں اور تعلیمات کو اپنا رہبر سمجھو جو کہ میں نے تمہیں سکھائی ہیں۔“ پھر ذرا توقف کے ساتھ انہوں نے بتایا کہ گردہ کے بڑے اور چھوٹے آدمی ایک دوسرے سے کیونکر خطاب کریں۔ اور یہ ان کے ایجاد کردہ قواعد میں سے آخری قاعدہ تھا۔

اس کے بعد انہیں کچھ آفاقہ ہو گیا۔ مگر یہ افات الموت

تھا۔ ہم انہوں نے اس سکون کی حالت میں بحیثیت مذہبی ہمیشہ کے یہ آخری کام کیا کہ چان نامی گروہ کے ایک آدمی کو بد زبانی کی سزا دی۔ پھر دو ایک گھنٹہ چپ رہ کر مریدوں سے کہا ”تم کو کسی بات میں کچھ شبہ و شک ہو تو رفع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں موقع نکل جانے پر پشیمان بنو“ مگر مریدوں میں اتنی تاب کہاں تھی کہ وہ کچھ دریافت کرتے۔ ان پر رنج و الم طاری تھا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری۔ گوتم نے خود ہی ذرا دم لے کر کہا۔ ”وصیان اور گیان میں غرق رہنے والے درویشو! لو اب میں تمہارے دلوں پر اس بات کا گہرا آتش جمائے دیتا ہوں کہ دُنیا کی تمام چیزوں کے اجزا فنا ہونے والے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ نہایت کوشش سے نجات حاصل کرو۔ یہ گوتم کے آخری الفاظ تھے اور اس کے تھوڑی دیر بعد وہ ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو گئے۔ حکمت و فلسفہ الہیات کا روشن چراغ گل ہو کر رہ گیا۔ گوتم مذہب نے عالم آخرت کا سفر کیا۔ اور مرید گریاں و نالاں اُن کی مٹی ٹھکانے لگانے میں مصروف ہوئے۔



شکرا چارج

نام و نسب :- شکرا چارج کا نام ”شکر“ تھا ۔
 باپ کا نام معلوم نہیں ہو سکا ۔ صرف اتنا پتا رہتا
 ہے کہ بزرگ باپ کا سایہ کم سنی ہی میں سر سے
 اٹھ گیا تھا ۔ اور ان کے نسب کا حال تاریکی میں
 رہنے سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ غالباً کسی
 نامی گرامی خاندان کے فرد نہ تھے ۔

ولادت :- شکر کی تاریخ ولادت نا معلوم ہے ۔
 ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نویں صدی عیسوی کے
 آغاز میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کی جائے ولادت جنوبی
 ہند کا قصبہ ”چتیاہر“ ہے ۔

تربیت اور تعلیم :- ایک ایسا بچہ جو کسی مشہور
 علم و دولت یا عزت و شہرت کے گھر میں نہ پیدا ہوا
 ہو ۔ ظاہر ہے کہ اس کی تربیت و تعلیم قدرۃً ہی
 بہتر ہو جائے تو خیر ۔ ورنہ اور کوئی صورت اس
 کے تربیت و تعلیم یافتہ ہونے کی نہیں ۔ شکر کے
 حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بارہ برس کے
 سن میں اپنی ”ماں“ کے ساتھ ”مالاہار“ میں رہتے
 تھے ۔ باپ صغیر ہی زمانہ ہی میں مر چکا تھا ۔
 ہوش سنبھال کر ”ماں“ کے سوا کوئی مڑبی اور
 سرپرست نظر نہ آیا ۔ اور وہ بیپاری بھی رائڈ اور

تجربے بضاعت - جس کو معمولی زندگی بسر کرنے کا سامان بھی مشکل سے میسر آتا تھا - تاہم قدرت نے شکر کی ماں میں یہ بڑا وصف رکھا تھا کہ اس نیک بی بی کی طبیعت ایک خاص قسم کی تھی - اور وہ بڑی مستقل مزاج عورت تھی - اس نے جس طرح بن پڑا اپنے نورِ نظر کو تعلیم دلائی - خود "شکر" بھی بقول کہے کہ "ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات" علم کے بیحد شایق تھے - مہرباں ماں کی توجہ نے اس شوق میں بڑا اضافہ کر دیا تھا - اور وہ جلد جلد تعلیم کے مدارج طے کر کے ابتدائی سے اعلیٰ تعلیم کے بلند زینہ تک پہنچ گئے - یہاں تک کہ سولہ سال کی عمر میں شکر نے تمام "شاستروں" اور حکمت و فلسفہ اور علم الہیات پر پوری طرح عبور حاصل کر لیا - اب وہ علاقہ مالابار ہی میں نہیں بلکہ سارے جنوبی ہند میں یکساں عالم و فاضل شمار کئے جانے لگے یہ

شکر کے بلند خیال اور عالی دماغ میں یہ بات جم گئی تھی کہ ہندوستان کے علم الہیات اور فلسفہ دین کی اصلاح ضروری ہے - بدھ کی رحلت کو ان کے زمانہ تک تقریباً پندرہ سو برس ہو چکے تھے - اور جو سادہ اور اعلیٰ درجے کا مذہب انہوں نے قائم کیا تھا - جل و تعصب کی بلانے اُسے برباد کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا اور اس کی جگہ برہمنی تعلیم مذہب نے اپنی ہوا باندھ رکھی تھی - ہندوستان

میں ہر طرف گہری تاریکی چھاٹی ہوئی تھی۔ اور علم کا
 بازار سرد پڑ گیا تھا۔ شکر نے ارادہ کر لیا کہ بجواہ
 اس بارہ میں ان کو کیسی مشکلوں کا سامنا ہو۔ لیکن
 وہ سرزمین ہند کو جو کسی زمانہ میں آریہ قوم اور
 مقدس رشیوں کے لئے پُر مسرت زندگی کا رما تھی
 پھر آراستہ اور مامون بنائیں۔ اس مقصد میں کامیابی
 کا طریقہ ان کو صرف یہی نظر آیا کہ علم کی اشاعت
 کریں۔ کیونکہ علم ہی ایک ایسی نعمت ہے جو انسان
 کو حقیقی آسودگی سے ہم آغوش بنا سکتی ہے۔
 شکر نے دیکھا کہ ان کا یہ مدعا بغیر اطراف ہند میں
 سیاحت کرنے کے حاصل نہ ہوگا۔ مگر مصیبت یہ تھی
 کہ ان کی ماں کسی طرح انہیں گھر سے باہر جانے کی
 اجازت نہیں دیتی تھی۔ ہر چند شکر نے عجز و اصرار
 کے ساتھ بار بار عرض کیا لیکن سب بے سود۔ آخر
 ایک دن جبکہ وہ اپنی ماں کے ساتھ نزدیک کے
 گاؤں میں مہمان بن کر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی
 کے وقت راستہ کا ایک چھوٹا سا نالہ پانی سے لبریز
 دیکھ کر اس میں گھس گئے۔ اور گردن تک پانی میں
 جا کر ماں سے کہا۔ ”اماں! اگر آپ مجھ کو سفر کی
 اجازت نہ دیتی تو لیجے میں ڈوبا مرتا ہوں“ مڑھیا
 ماں یہ حالت دیکھ کر بے اوسان ہو گئی۔ دل پر جبر
 کر کے کہا۔ اچھا بیٹا! تو ایسا ہی بضد ہے تو چلا
 جائیو میں اب نہ روکونگی۔ شکر اس بات کو سن کر

خوشی کے نامے باغ باغ ہو گئے۔ نالے سے باہر نکلے۔
ماں کو کندھے پر چڑھا لیا۔ اور پھر اس کو عبور کر کے
گھر پہنچ گئے +

اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد شکر نے سیر و سفر کا
ارادہ کر کے مالابار کو الوداع کہا۔ دکھیا ری ضعیفہ ماں
کو اپنی جدائی پر روتے دھوتے پھوٹا۔ اور کوئی ان کا
سر پرست اور رفیق نہ تھا جو ان کے ہجر سے بیتاب
ہوتا۔ ایک غریب یتیم بچہ کے حالات کی خبر لینے والا
کون ہو سکتا تھا۔ کسی کو اس بات کی فکر بھی نہ
ہوئی کہ کس نے سفر کیا ہے۔ ہاں شکر کی ماں اپنی
گریہ و زاری سے گھر کے سامنے نکلنے والوں کو اپنے
حال پر متوجہ بناتی اور ان کو اپنا دکھڑا منہ کرانے سے
شکر کو برا بھلا کہلاتی تھی لیکن یہ کسی سے نہ ہوتا کہ
اس غمزدہ کی دلیری کرے اور اس کے دکھ پر تاسف نہ
ہو کر اسے شکر کی خبر لا دے +

کارنامے :- شکر نے سولہ برس تک ہندوستان
کی خاک چھانی وہ شمال میں ہمالیہ پہاڑ تک گئے۔
راشتہ میں جتنے مشہور اور متبرک مقام اور جس قدر
علم و حکمت کے گھر ملے سب کی زیارت سے مشرف
ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں کے بڑے بڑے نامی علما
سے بحث و مناظرہ کیا۔ اور ان کو اپنی سحر اثر تقریر
کے روز سے اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ہندوستان کے علما
و حکما۔ اور عبادت گزار زاہد آبادی سے الگ جنگلوں اور

پہاڑ کے غاروں میں رہا کرتے تھے۔ شکر نے سب سے ملاقاتیں کیں۔ اور انہیں بتایا کہ شاستروں کے سمجھنے کا جو طریقہ انہوں نے نکالا ہے وہی راہ راست ہے۔ اور اس طرح انہوں نے تاریکی کو روشنی سے بدل دیا۔ اور نادانی کی جگہ علم و دانائی کو جلوہ گر کیا۔ غرض تقریباً۔ بلکہ تمام فضلاء ہند کو انہوں نے اپنا ہمسفر بنا لیا۔

شکر نے گوتم بدھ کے مردہ فلسفہ اور تعلیم کو زندہ کیا۔ اس میں نئی روح پھونکی۔ اور بدھ کی طرح ایک مذہب کے بانی بنے۔ انہوں نے چار اطراف ہند میں ایک ایک عظیم الشان درویش خانے کی بنیاد رکھی۔ یہ خانقاہیں ”مٹھ“ کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اور ان کے رہنے والے سنیاسی کہلاتے۔ شکر کی بنیاد کردہ خانقاہوں کے نام و مقام حسب ذیل ہیں: (۱) سرنگاری مٹھ۔ ملک کشمیر میں (۲) سرودھا مٹھ۔ دوارکا میں۔ (۳) گوہر دھن مٹھ۔ سری کھیتھر میں۔ (۴) جوشی مٹھ۔ بدوڑک آشرم میں۔ اور شکر کے مقلدین نے جملہ دس مٹھ تعمیر کئے۔ جن میں سے ہر ایک کسی مشہور سنیاسی کے نام سے منسوب ہے۔ اور گو زمانہ کی نیرنگی نے بدھ مت کے زاہدوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رکھا۔ لیکن شکر کے سنیاسی اب تک دُنیا میں موجود نظر آتے اور ان کے کام کی عظمت کا پتا دیتے ہیں۔ شکر نے گو ایک طرح مذہب بدھ کو تازہ اور

نئے روپ میں جلوہ گر کیا تھا۔ اور اس بارہ میں وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن آریہ مذہب کی اصلاح میں ان کو پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ انہوں نے آریہ یا برہمنی مذہب کی دینی کتابوں پر بسیط اور اعلیٰ درجہ کی شرحیں لکھیں۔ ہندو فلسفہ الہیات کو خوب چمکایا۔ اور اپنی تصانیف سے ثابت کر دیا کہ ان کی تیغ قلم علی دنیا کی خلق ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تصنیفات نے ”فتوحات“ کا نام پایا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی یہ اصلاح کوئی عمدہ اثر نہ لاسکی۔ اور ویداتی مذہب جس کا ماخذ ”وید“ اور ”اپنشد“ تھے۔ زمانہ کی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ بلکہ بعد میں ایسا خلط مبعث ہوا کہ شکر کے مروجہ مذہب کو ویدانتی دین سے ممتاز ہو جانا پڑا۔ حالانکہ اس کا ماخذ وہی ویدانتی دین تھا اور مدعا بھی اسی دین کی استواری ۛ

ہند کے تمام چلن سار مذاہب میں بت پرستی نے ایسا رواج پکڑ لیا تھا کہ شکر کا اس پر دماغ سوزی کرنا اور اس کو زائل بنانے میں کوشاں ہونا کچھ بھی کام نہ آیا۔ اور آخر کار انہوں نے تنک کر کسی قدر ترمیم کے ساتھ اپنے مٹھوں اور مندروں میں بھی سورتیاں قائم رکھیں۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جن لوگوں کی چشم بصیرت کھل گئی ہے وہ بتوں کو قابل تعظیم نہ سمجھیں گے بلکہ خالق حقیقی کی طرف لو لگا بیٹھیں گے۔ لیکن عام جملہ کو پرستش کے لئے بتوں سے بڑی مدد مل سکیگی۔ اور

ان کا وجود انہیں یہ نفع دیگا کہ عبادت کے وقت ان کا خیال ایک مرکز پر متوجہ ہو کر ان کی طبیعتوں میں خشوع و خضوع پیدا کریگا ۛ

تصانیف :- شکر کی تصنیفات زیادہ تر مذہبی کتب کی شرحیں ہیں یا تفاسیر۔ ان کی تصانیف کو ”فتوحات“ کا نام ملا ہے۔ اور تفسیروں میں ویدانت کے فلسفہ اپنشد اور بھگوت گیتا کی تفسیریں ذکر کے قابل ہیں۔ شکر کی تالیفات میں بڑی خوبی ان کی عبارت کا سشتہ - شیریں - اور لوچ دار ہونا ہے۔ خیالات بچہ بلند ہیں۔ اداسے مطلب کے طرز اور منشیانہ تحریر کی صفت نہیں کی جا سکتی۔ اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کسی زبان کے مصنفین میں اتنا اعلیٰ درجہ کا قابل انشا پرداز مشکل سے مل سکتا ہے ۛ

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شکر نے تصنیف و تالیف کا کام ۱۶ برس کی عمر سے شروع کیا تھا۔ اور یہ عمر بچپن ہی میں شمار ہوتی ہے پھر دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شکر نے صرف ۳۲ سال کی عمر پاؤں وہ ۱۶ برس تک محض تعلیم اور تکیلی علوم میں مصروف رہے اور ۱۷ برس کی عمر سے اخیر وقت تک ۱۵ یا ۱۶ سال سیاحت اور تصنیف و تالیف میں بسر کئے۔ یہ ظاہر ہے کہ سفر اور جہان گردی کی حالت میں انسان کو ایسا اطمینان بہت کم نصیب ہوتا ہے۔ کہ وہ دل جمعی کے ساتھ تصنیف کا نازک کام کر سکے۔

لیکن شکرہ کا ۱۴ سال کے قلیل زمانہ میں جنوب سے لے کر شمال تک تمام ہندوستان کی سیر کرنا۔ اور ہر جگہ وعظ و پند اور علمی گفتگو میں مصروف رہنا اور پھر ایسے زمانہ میں سفر کرنا جبکہ نقل و حرکت کے وسائل بہت کم تھے اور جو تھے وہ ناکارہ۔ یا کم از کم شکرہ جیسے مفلس شخص کے واسطے مشکل سے حاصل ہونے والے۔ اس پر ان کا کثیر تعداد کی ضخیم کتابیں بھی اپنی یا وگار چھوڑ جانا ایک ایسا کام ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ غیر معمولی انسان تھے۔ غرض شکرہ نے ہندوستان کے فلسفہ مذہب اور یہاں کی دینی کتب پر شرحیں لکھنے کے علاوہ بیشمار مستقل تصانیف بھی کیں اور ان کی کتابیں تمام مصنفین کی کتب سے افضل پائی گئیں۔

وفات بہ شکرہ نے ۱۴ سال کا زمانہ ہندوستان میں سیر و سفر اور دینی مناظروں میں بسر کیا۔ اس عرصہ میں وہ صرف ایک مرتبہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے اپنے ملک دکن میں بھی گئے تھے۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ دکھیااری عورت خدا کے ہاں جانے کی تیاری کر چکی تھی۔ چنانچہ اس کی مٹی ٹھکانے لگا کر شکرہ پھر دکن سے کشمیر سے چلے آئے اور اپنی زندگی کا باقی حصہ ”مرنگا گری“ مٹھ میں بسر کیا۔ وفات سے چند مہینے قبل شکرہ نے ”جوشی مٹھ“ کی طرف سفر کیا۔ اور وہاں سے ”کدار ناتھ“ کو گئے۔ جہاں کہ اس دین کے اعلیٰ

مصلح اور بڑے مثل واعظ و عالم نے ۳۲ سال کی عمر میں دار نا پائدار سے رخت سفر باندھا اور عالم آخرت کا صبح کیا +

شکر ایک بیس اور یتیم لڑکا تھا۔ علم و فضل کے اکتساب اور ملک و قوم کی سچی خدمت نے اسے اتنی عزت بخشی کہ وہ علمائے وقت کا سرتاج۔ بے مثل مصلح۔ بے نظیر مُصَنَّف۔ اعلیٰ درجے کا راست باز۔ اور اپنے زمانہ کے تمام انسانوں سے ممتاز ہو گیا۔ شکر سے ”شکر اچارج“ کہلایا اور اس کے ہوطنوں نے وفات کے بعد اسے دیوتاؤں کی صف میں جگہ دی۔ اس کی تصنیفات آج تک ہندوؤں کے فلسفہ اور علم دین کے سمجھنے کی سبھی تسلیم کی جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے بدھ و ان پندتوں کا انہی کتابوں پر دار و مدار رہتا ہے اس کی عملی زندگی اگرچہ صرف سولہ سال کی ہے۔ لیکن اتنے ہی عرصے میں وہ ایک گمنام لڑکے سے بڑھ کر ہندوستان کی علمی اور عملی دنیا میں چوٹی کا آدمی ہو جاتا ہے۔ اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے یہ مفید سبق چھوڑ جاتا ہے کہ سعی و محنت ہی انسان کی زندگی کو کامیاب بنانے کا راز ہے۔ اور اسے ناموری و عزت کے آسمان پر چڑھانے والا زینہ ہے۔ اس کے بغیر نہ دنیا میں کوئی ہوا ہے۔ اور نہ ہوگا +



کبیر

کبیر ہندوستان کے اُن خدا شناس فیلسوفوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی پننتھ (طریقہ-یا-مذہب) کی نئی مبنیاد ڈالی۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ کسی سراپا جدید مذہب کے بانی تھے۔ نہیں وہ اپنے وقت سے قبل کے مروجہ مذاہب میں ضرورت زمانہ اور مناسبت حال کے مطابق ایک قسم کی اصلاح کرنے والے تھے اور بس۔ کبیر کے مذہب میں سرتاپا سادگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ خدا کا ناقنا ہی عشق ان کا مقصد تھا۔ وہ اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ اور عبادت الہی کو نجات کا طریقہ ٹھہراتے تھے +

کبیر کے نام و نسب اور ان کے ابتدائی حالات کا مستند طور سے کہیں پتا نہیں ملتا۔ جب وہ ایک خاص طریقہ کے موجد اور مذہب میں ایک نئی اُمت کے بانی ہو کر دُنیا سے روشناس ہوئے اُس وقت لوگوں میں ان کی اصل و نسل کا پتا چلانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور چار و ناچار رطب و یابس روایتوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ لہذا ہمیں بھی بجز ان روایات سے اخذ کرنے کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اور وہ روایات حسب ذیل ہیں :-

مشہور قول یہ ہے کہ کبیر کی ماں ایک برہمن

کی بیوہ بڑکی تھی۔ بحالت بیوگی یہ اس کے بطن سے پیدا ہوئے اور ماں نے اپنی رسوائی کے خوف سے ان کو پیدائش کے بعد ہی کسی جنگل میں پھینک دیا۔ نور ہی نام ایک نور بان اپنی بی بی کے ساتھ کسی گاؤں میں دعوت کھانے جاتا تھا۔ جنگل میں معصوم بچہ کو پڑا پایا۔ اس کے بلکنے اور تڑپنے پر رحم کھا کر اٹھا لیا۔ اور اولاد بنا کر پالا پوسا ۛ

کبیر کو لڑکپن ہی سے مذہبی خیالات سے اُنس تھا۔ پرورش کرنے والے باپ نے جوانی میں ان کی شادی کر دی تھی۔ لیکن کبیر کو بی بی سے کوئی گہرا لگاؤ نہ تھا۔ وہ بنارس کے متبرک شہر میں گلی کوچوں کا گشت لگاتے پھرتے تھے۔ دل بیتاب تھا اور یہ نو لگی ہوئی تھی کہ کوئی کامل رہنما ملے۔ اسی حالت میں ایک روز گھر کو واپس آنے کی بھی سُدھ نہ رہی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ آخر دریائے گنگا کے کنارے ایک پختہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر لیٹ رہے اور سو گئے۔ نور کے تڑکے مشہور واعظ اور مصلح عابد راماوند گنگا میں اُشان کرنے آئے۔ اُجالا پوری طح پھیلا نہ تھا۔ اندھیرے میں راماوند کا پاؤں کبیر کے سینے پر پڑا۔ اور وہ آدمی کا جسم اپنے قدم سے کچلتے دیکھ کر جھجک گئے۔ زبان سے افعال کی حالت میں ”رام رام“ کی صدا بھل گئی۔ اور کبیر اس آواز سے بیدار ہو کر اٹھ بیٹھے۔ پھر اُنہوں نے کہا ع جس کی ہوس تھی آج اُسے میں

نے پالیا + اور راماند کے قدموں سے پیٹ گئے +
 راماند نے دیکھا کہ جوان ہونہار ہے اور پہلو میں
 سیدہ دل رکھتا ہے خوش ہو کر اس کو اپنے ساتھ
 لے لیا۔ اور اپنے مٹھ میں لاکر اسی دن باقاعدہ اپنا
 مرید بنا لیا۔ کبیر نے خدا شناسی اور عرفان کے مارج
 طے کرنے شروع کئے اور آخر کار وہ طریقت میں اپنے
 گروہ سے بھی فوقیت لے گئے۔ غالباً مرشد کی زندگی
 میں کبیر نے اپنا کوئی خاص طریقہ نہیں بنایا۔ لیکن
 راماند کے فوت ہوتے ہی۔ ان کی تعلیم کا اقتدار
 دنیا میں واضح ہو چلا۔ اور ان کا مذہب ہندوستان کے
 دوسرے موجودہ مذاہب پر سبقت لے جانے کا نشان
 ظاہر کرنے لگا +

کبیر نے اپنے مرشد کے بعد زندگی کا باقی حصہ
 مذہبی وعظ و ہدایت میں صرف کیا۔ چونکہ ان کی تلقین
 دلکش عام فہم نظم کے پیرایہ میں ہوتی اور گاکر لوگوں
 کو سنائی جاتی تھی۔ اس واسطے وہ بیحد موثر ثابت ہوئی۔
 ان کے بکت اور گیت بڑے شوق سے سنے جاتے۔
 جہاں یہ گانے ہیں مصروف ہوتے آدمیوں کا ٹٹھہ
 بندھ جاتا تھا۔ کبیر کسی کو اپنا مذہب اختیار کرنے کی
 طرف رغبت نہیں دلاتے تھے۔ وہ عام طور سے خدا
 کی معرفت کے گیت گاتے۔ مذہبی پابندیوں کو بیجا
 رسم و رواج کہتے۔ اور ان سے آزاد رہنے کی ہدایت
 کرتے۔ وہ کسی قوم اور ملت کے پابند نہ تھے۔ نہ کوئی

علم الاصنام یا علم الالہیات تعلیم کرتے تھے۔ بس ایک
 با صفا خدا فناس بزرگ تھے۔ اور عشق الہی کے سوا
 ان کی کوئی تلقین نہ تھی۔ کبیر نے اہل ہند کو یہ سبق
 پڑھایا کہ اختلاف ملت و مذہب کا مقصد انسانوں میں
 عداوت و عناد کا پھیلانا ہرگز نہیں۔ اپنی اپنی راہ پر
 ہر شخص چلتا رہے۔ مگر انسانی برادری اور صلح کل
 ہونے کا خیال رکھے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمدردا عذر بند
 چوں ندیدند حقیقت رو افسانہ زوند

کبیر نے بڑی دلیری سے کہا کہ مذہب کوئی ضروری
 چیز نہیں۔ اگر کوئی امر لازمی اور قابل ماننے کے ہے
 تو وہ ایک معرفت الہی ہے اور قدرت کاملہ کا سچا عشق۔
 ان کا طریقہ یہی تھا کہ قدرتی چیزوں کے آئینہ میں
 قادر مطلق کا جلوہ دیکھو اور اصلی خالق کے گرویدہ بنو۔
 وہ کہتے تھے۔

عالم میں چھا رہا ہے ہر سمت نور تیرا
 ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا
 اخلاق و عادات :- ایک ایسی کوئی ہے جس
 سے انسان کا کھرا کھوٹا ہونا پرکھا جاتا ہے۔ کبیر کی
 عادت و خصلت کے متعلق یوں تو بکثرت روایتیں
 ہیں۔ لیکن ایک خاص بات جو قوٰتر کے ساتھ سب
 تذکرہ نویسوں نے بیان کی ہے یہ ہے کہ کبیر گداگری
 کے ذریعے جو کچھ کما کر لاتے وہ سہان نوازی اور

فقیروں کو کھلانے میں صرف کر ڈالتے تھے۔ ان کا قیام شہر سے باہر ایک کھو میں رہتا تھا۔ کبیر کی بی بی ”لوئی“ نہایت حسینہ و جمیلہ عورت تھی اور اپنے پاکیزہ منش شوہر کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے بیس سے زیادہ فقیر کبیر کے یہاں مہمان بننے کو آ گئے۔ ان کی یہ حالت کہ گھر میں کچھ نہیں۔ بہت گھبرائے اور حد سے زیادہ پریشان ہوئے۔ بی بی نے ان کو مترّد دیکھ کر کہا ”تم اتنے ہراساں کیوں ہو؟ کبیر نے ترّد کی وجہ بتائی۔ ان کی عیضہ بیوی نے جواب دیا کہ ”تم کہو تو فلاں ساہوکار کے بیٹے سے کچھ روپے لے آؤں“ کبیر نے کہا۔ ”کیا خوب! اس سونم کے بچے سے کب قرض مل سکتا ہے۔ اس کا باپ بڑا کنجوس ہے۔ وہ کبھی کوڑی نہ دیگا۔“ بی بی ”مگر وہ مجھ سے اظہار محبت کیا کرتا ہے۔ اور غالباً میرے کہنے کو رو نہ کریگا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کو اس بد نظری کی کچھ سزا بھی دوں۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ سر دست اس سے کچھ روپیہ ایٹھ لیا جائے“

کبیر نے یہ صلاح مان لی۔ اور کرتے کیا۔ ضرورت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ غرض لوئی گئی۔ اور ساہوکار کے بیٹے کو یہ دم دے کر کہ وہ رات کو اس سے لیگی روپیہ لے آئی۔ کبیر نے فقیروں کے کھانے پینے کا سامان کیا۔ اور جب ان کی تواضع سے

فارغ ہوئے تو سخت اندھیری اور بارش کی رات
 ہیں جبکہ نہایت زور کا مہینہ برس رہا تھا۔ بی بی کو
 کندھے پر چڑھا کر پانی سے بچاتے ساہوکار بچہ
 کے دروازے پر لے گئے۔

وہاں دروازہ چشم منتظر کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ساہوکار
 کا لڑکا تو بایوس ہو گیا تھا۔ کہ ایسی طوفانی شب میں
 ”لوٹی“ کیوں آئیگی۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی حد
 نہ رہی جب اس نے اپنی محبوبہ کو اپنے کمرے میں
 داخل ہوتے دیکھا اور لوٹی کا ایک مٹوے بدن بھی
 پانی سے بھیگا ہوا نہ پایا۔ وہ متعجب ہو کر کہنے لگا:-
 ”تم اس آفت میں کیونکہ آئیں؟ اور پانی میں بھیگی
 بھی نہیں ہو۔ یہ عجیب بات بلکہ کرامات ہے کہ تمہارے
 لباس کا کوئی تار تک بھیگا ہوا نہیں۔ اور پیروں میں
 کیچڑ مٹی نہیں سنی ہے۔“

لوٹی: ”یہ کرامت تو نہیں۔ ہاں امر واقع ہے کہ
 میں پانی اور کیچڑ مٹی سے بالکل محفوظ ہوں۔ لیکن
 اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے شوہر مجھ کو بارش سے
 بچا۔ اور کندھے پر چڑھا کر یہاں لائے ہیں۔“

ساہوکار کا لڑکا (بہوت ہو کر) ”تم کو تمہارے میاں
 نائے ہیں! یہ کیا کہتی ہو؟“

لوٹی: ”سچ کہتی ہوں۔ اس میں جھوٹ کیا ہے۔
 یقین نہ آئے تو دروازہ کی دیوڑھی میں کھڑے ہیں۔ دیکھ لو۔“
 ساہوکار کا بیٹا اس بات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس

نے لوٹی کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کہا "تم آج
سے میری بزرگ مان ہو۔" مائے میں کیسا نالائق
ہوں کہ ایسی بیہودہ خواہش میرے دل میں آئی۔
پھر ڈیوڑھی میں جا کر کبیر کے قدم چومنے اور ان
سے معافی طلب کرنے لگا۔ بلکہ اسی وقت تیرے دل
سے ان کا چیلہ بن گیا۔

کبیر خالق اکبر اور پروردگار عالمیان کی شان
بے نیازی کے بے مثل منظر تھے۔ وہ کسی خاص مذہب
و ملت کی قید میں مقید نہ تھے۔ ہر مذہب کے آدمیوں
کو ان سے ایکساں فیض پہنچتا تھا۔ ان کے ہندو بھی
اتنے ہی مقید تھے جتنے کہ مسلمان۔ چنانچہ جس وقت
محبوب حقیقی سے وصال ہوا۔ ہندو مسلمانوں میں باہم
یہ نفیض پیدا ہو گئی کہ ان میں سے ہر ایک لاش
کی تجنیز و تکفین اور اسے اول منزل پہنچانے کے
لئے اپنے رسم و رواج سے کام لینا چاہتا تھا۔ مشہور
ہے کہ ایک جانب بنارس کا راجہ ہندوؤں کا بھاری
جھٹکا لئے ہوئے کبیر کی لاش آگ کی نذر کرنے پر
تلا تھا۔ اور دوسری سمت بڑی خاں مسلمان حاکم اہل اسلام
کے گروہ کشیر کے ساتھ کبیر کی میت اسلامی طریقے پر
مکفون اور مدفون کرنے پر آمادہ تھا۔ قریب تھا کہ دونوں
گروہوں میں تلوار چل جائے لیکن صلح جو اور امن پسند
کبیر کی روحانیت نے یہ جھگڑا بڑی خوبی سے فیصل
کر دیا۔ فریقین میں طے پایا کہ پہلے گرو کی لاش ہی

سے استھواب کیا جائے اور کفن اتار کر دیکھا جائے۔ اگر ہندو مذہب کی علامت نمایاں ہو تو ہندوؤں کی فتح ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی کامیابی۔ بہر حال کفن اتارا گیا اور اوپر کی چادر ہٹاتے ہی لاش کی جگہ پھولوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ سب آدمی اس بات کے معاینہ سے حیران رہ گئے۔ اور اب راجہ بنارس نے آدھے پھول لے کر دریائے گنگا کے کنارے نذر آتش کر کے رائے پر ایک مٹھ بنوا دیا۔ یہ مٹھ ”کبیر چورا“ کہلاتا اور ان کے پنتھ کے ہندو درویشوں کی زیارت گاہ ہے +

دوسرے آدھے پھول بڑی خاں نے لے لئے۔ اور ان کو کبیر کی وفات مقام گمٹھ میں سپرد کر کے اس پر قبر بنوا دی۔ یہ قبۃ مسلمانوں کی جائے زیارت بنا ہے +

کبیر کے پہلے ہندوستان میں کوئی بزرگ دو بالکل مختلف العقیدہ جماعتوں کے ایسے مسلم ولی نہیں ہوئے ہیں۔ کبیر کے حال پر عرفی شیرازی کا یہ شعر بالکل چسپاں ہے ۔

چناں بانیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن
سلمات بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

لے گھر گورکھپور سے چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جیٹی ہے اور ان دنوں وہاں ریلوے اسٹیشن بھی بنا ہے۔ کبیر کا مقبرہ ٹرین پر سے صاف نظر آتا ہے + مولف

کبیر کی تعلیمات میں سے چند اخلاقی مقولے حسب ذیل

ہیں :-
 (۱) تسبیح کا ایک ایک دانہ گنتے رہ کر عمر بسر کر دی
 لیکن دل کا غرور دور نہ ہوا۔ لہذا تسبیح کی دانہ شماری
 سے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی دل کو صاف کرے +
 (۲) منوں چیتھڑے لاد کر ہر دوار کی جاترا بے سود
 ہے جب عشقِ الہی کے چراغ سے کاشانہ دل شمع
 نہ کیا۔ اور بیت اللہ میں سجدہ کرنا لا حاصل ہے جبکہ
 دل سے کھوٹ کپٹ دور اور اس کو خدا کی پتی محبت
 کی روشنی سے پُر نور نہ بنایا۔ ایسی جاترا۔ اور اس طرح
 کاج فضول و نامقبول ہے۔ ساری گلستاں بوستاں
 پڑھ کر سعدی کا مدعا نہ سمجھے تو یہ علم و فضل خاک
 بھی نافع نہیں +

(۳) مجھے محبوب حقیقی کے کلام سے وہ عشق
 ہے کہ اس کے سوا اور کسی طرح میری تسکین ممکن
 نہیں۔ مچھلی کو سونے کے برتن میں رکھکر آبِ حیات
 پلانا بھی اس کی موت کو نہ روکیگا۔ خدا کو وہی
 پال سکتا ہے جس کے دل میں اس کے عشق نے
 گھر کیا ہے +



بابا نانک

نام و نسب اور ولادت :- نانک نام۔ اور کالو کھتری کے بیٹے تھے۔ نانک کے والد تلونڈی نامی گاؤں میں رہتے اور حساب کتاب لکھنے کا کام کرتے تھے۔ نانک اسی موضع میں پیدا ہوئے۔ باپ کو فرزند زینہ کی ولادت نے مسرت سے مالا مال کیا۔ اور اس کے دل میں نور دیدہ کے آئندہ اقبال و عظمت کی توقع کا چراغ روشن ہوا۔ *

تربیت و تعلیم :- کالو جیسا کہ اوپر لکھا گیا قوم کھتری کے فرد تھے۔ ابھی کھاتا لکھنا۔ اور تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اولاد کو بھی اسی ڈھب کا بنانے لگے۔ جب نانک کی عمر پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی تو ان کو فارسی زبان اور معمولی حساب کتاب سکھایا۔ ذہن اور حافظہ قدرت کی طرف سے اچھا ملا تھا۔ نانک نے بہت جلد ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے کر لیا اور لکھنے پڑھنے میں ہوشیار ہو گئے۔ لیکن نانک کا دل دُنیا کے دھندوں میں نہ لگتا تھا۔ کالو کی مرضی یہ تھی کہ تخت جگر کو بیچ بیوپار کے کام میں ڈالے۔ ایک دن ان کو چالیس روپے دے کر ایک جاڑ کے ساتھ کیا اور حکم دیا کہ فلاں گاؤں میں جا کر اس قیمت سے مال خرید لاؤ۔ راستہ میں نانک کو کچھ فقیر ملے۔ ان کو بھوکا اور

محتاج دیکھ کر نانک نے کچھ روپیہ انہیں دینا چاہا۔ مگر فقیر کہنے لگے۔ بابا ہم روپے لے کر کیا کریں۔ بھوکے ہیں کچھ کھلا دے۔ یہ سن کر نانک شہر گئے۔ چالیس روپے کا آٹا خریدا اور لا کے روٹیاں پکوائیں۔ پھر درویشوں کو کھلا کر گھر لوٹ آئے۔ آنے کو تو گھر آ گئے مگر باپ کی خفگی کے ڈر سے مکان کے پاس ایک درخت پر چڑھ کر چھپ کے بیٹھ رہے۔ باپ کو معلوم ہوا وہ ڈھونڈھتا ہوا آیا اور گھر لے گیا۔ دریافت کیا کہ روپے کیا کئے اور کیا مال خریدا؟ نانک نے جو بات سچ تھی صاف کہ دی اور پھر کہا۔ آپ نے روپیہ اس لئے دیا تھا کہ نفع کے کام میں لگاؤں۔ میں نے اسے آخرت کے ہمیشہ رہنے والے فائدے میں لگا دیا۔ اور ثواب کما لیا۔ کالو بیٹے کی یہ تقریر سن کر آگ ہو گیا۔ اس کو کیا خبر تھی کہ یہ لڑکا موجد کامل اور سرآمدِ درویشاں ہوگا۔ دُنیا میں خواب غفلت کے متوالوں کو بیدار بنائیگا۔ اور سب کو جہان باقی کے نفع کا راستہ دکھائیگا۔ بیٹے کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اور اسے تنبیہ کے لئے مارنے پر تیار ہوا۔ مگر اتفاق سے اسی وقت ایک مسلمان زمیندار وہاں آ گیا اور چونکہ وہ کسی قدر نانک کے حالات سے آگاہ تھا لہذا کالو کو اس کے مارنے پیٹنے سے مانع آیا + کالو نے آزما دیکھا کہ بیٹا دنیا کے کار و بار کا اہل نہیں تو اس کو بڑا رنج ہوا۔ اکثر اس کو گھر کتا

جھڑکتا رہتا۔ اور اُس کی صورت سے بیزار تھا۔ لیکن
 ماں کی مانتا نانک کو باپ کے غصہ سے بچاتی رہی۔
 جب کالو نے بیٹے کی نکل اپنے حسب مرضی سیدھی ہوئی
 نہ دیکھی تو مجبور ہو کر نانک کو ریاست کپورتھلہ کے
 علاقہ میں بمقام سلطان پور بھیج دیا۔ یہاں نانک کی
 بہن بیابھی تھی۔ اور اس کا بہنوئی نواب دولت خاں
 لودھی کی سرکار میں ملازم تھا وہ نانک کو بھی نواب
 کے دربار میں لے گیا اور ان کو مودھی کی خدمت
 دلوا دی۔ نانک کو اب اپنی طبیعتی فیاضی دکھانے کا اچھا
 موقع ملا۔ سدا برت بٹنے لگا اور دان پُن کا سلسلہ
 جاری ہوا۔ نانک کی شاہ خرچیوں کا شہرہ ہوا۔
 حاسدوں نے نواب کے کان بھرے کہ مودھی غبن
 کرتا ہے۔ ورنہ اتنا خرچ کہاں سے کر سکتا ہے۔
 حساب کتاب کی جانچ ہوئی تو نانک بری الذمہ نکلے۔
 بلکہ انہی کا کچھ روپیہ نواب پر فاضل گرا۔ نانک کی
 سچی سخاوت اُن کے آڑے آ گئی اور خدا نے ان
 کے دشمنوں کے مُنہ میں خاک بھر دی +
 جس وقت نانک نواب کے یہاں مودھی تھے۔
 اسی وقت بٹالہ کے علاقہ میں ایک کھتری کے یہاں
 ان کی شادی بھی ہو گئی۔ اگرچہ ان کو دُنیا داری کے
 جھگڑوں میں پڑنا منظور نہ تھا۔ لیکن وہ کسی طرح
 گزر کرتے رہے۔ اسی حالت میں دو بیٹے سری چند
 اور لکھھی داس پیدا ہو گئے +

ریاضت اور ترک دنیا :- بابا نانک کے دل پر
 دنیا کی بے ثباتی کچھ ایسی نقش ہو گئی تھی کہ وہ اس
 عالم کے فرخفات پر کبھی توجہ ہی نہ کرتے تھے زیادہ تر
 سیر و سیاحت میں رہتے اور اس پردہ میں دنیا کی
 لذتوں سے الگ ہو کر خدا کی یاد اور نفس کشی کرتے تھے۔
 ان کے عقیدے کی بنیاد توحید اور صلح کل کے اصول پر
 تھی۔ ان کی باتیں ایسی ہوتی تھیں کہ دل سے نکلتیں
 اور دل ہی میں گھر بنا لیتیں۔ ہر درجہ اور عمر کے
 آدمی ان کی گفتگو سے محفوظ اور مسرور ہوا کرتے اور
 ہر ایک مذہب کے آدمی ان کو عزت و عظمت کی نظر
 سے دیکھا کرتے تھے۔ بابا نانک نے اسی حال میں
 درویشانہ ریاضتیں بھی کیں۔ دریائے بیاس میں تین
 دن تک پانی کے اندر شبانہ روز کھڑے دھیان گیان
 میں مصروف رہے۔ پھر ایک درخت کے زیر سایہ
 بیٹھ کر عبادتِ الہی کی۔ اوریوں ہی ہوتے ہوتے گھر بار
 کنبہ اور قبیلہ سے الگ ہو بیٹھے۔

بابا نانک کے خسر نے یہ رنگ دیکھا تو اس کو
 کمال صدمہ ہوا۔ وہ نواب کے دربار میں حاضر ہو کر
 عرض پیرا ہوا کہ آپ نانک کو سمجھائیں۔ اور فرائض
 دنیاوی کی بجا آوری پر اسے آمادہ بنائیں۔ نواب
 صاحب کے آدمیوں کو بھی بابا نانک نے ٹال دیا۔
 اور وہ ایسے دھن کے پکے ہو گئے تھے کہ کسی طرح
 باز نہ آئے۔ اس زہد و ریاضت نے بابا نانک کو

روشن ضمیر بنا دیا تھا۔ وہ ایک روز تواب دولت خاں کے پاس آئے تھے۔ نواب انہیں مسجد میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے نماز کی نیت باندھی۔ بابا صاحب الگ بیٹھے رہے۔ سلام پھیر کر نواب نے پوچھا ”بابا نانک ! آپ عبادت الہی میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ بابا نانک ”تم تو قندھار میں گھوڑے مول لیتے تھے میں نماز کس کے ساتھ پڑھتا؟“

تواب نے اعتراف کر لیا کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ اور اسی طرح بابا صاحب نے ایک دن قاضی صاحب کو بھی معقول کر دیا۔

بابا نانک نے اب گھر بار کو بالکل سچ دیا۔ ان کے بال بچے ان کے باپ کے گھر جا رہے۔ نانک نے شہر بہ شہر پھرنا شروع کیا۔ خدا کو یاد کیا کرتے۔ آنکھیں بند اور دل کا دروازہ کھولے رکھتے۔ اس حالت میں اُن کے دو رفیق تھے۔ ایک کا نام بالّا۔ اور یہ ہندو تھا۔ اور بچپن کا قدیم دوست۔ اور دوسرا مردانہ مراٹھ۔ مسلمان تھا۔ مردانہ بابا نانک کو مراقبہ اور یاد الہی کے وقت معرفت کے گیت گاکر مساتا اور ان کے جذبیہ شوق میں تحریک پیدا کیا کرتا تھا۔ اس نے بڑی ہمت دکھائی اور سخت سے سخت تکلیفوں میں مبتلا ہونے کے باوجود کبھی رفاقت نہ چھوڑی۔ بابا نانک نے اسی سیر و سفر کے دوران میں چند روز امین آباد میں بسر کئے جس ویرانے میں

ان کا قیام ہوا تھا۔ وہاں اردگرد کے پتھروں کو
 چن کر ایک ہموار سطح بنالی تھی۔ سکھ روڑی اس
 جگہ کا نام ہے۔ بہت سے آدمی ان کی صفائے باطن
 اور خدا پرستی کے معتقد ہو گئے۔ انہی دنوں بابر بادشاہ
 ہندوستان میں آیا تھا۔ اس کے لشکر نے امین آباد کو
 لوٹ لیا۔ بابا نانک اور ان کے مرید بیگار میں پکڑے
 گئے۔ مگر ان کے موحدانہ کلام نے بابر کے سپاہیوں
 کو اپنا فریضہ بنا لیا اور ان کو دربار میں پہنچایا گیا۔
 بابر نے درویش با صفا سمجھ کر تعظیم و تکریم کی اور
 دُعاے خیر حاصل کی۔ ان کی باتوں سے خوش ہوا۔
 محفل سرور میں دُور جام چلتا تھا۔ ان کی تواضع بھی
 کی گئی۔ لیکن نانک نے انکار کیا اور بہت لطیف
 پیرایہ میں انہوں نے کہا: ”اس کا نشہ تو تھوڑی
 دیر میں اُتر جاتا ہے۔ میں نے وہ نشہ پیا ہے
 جو ہمیشہ سرور میں رکھتا اور خمار کی زحمت نہیں دیتا۔
 مجھ کو اس سے معاف رکھئے“ بادشاہ کو یہ لطیفہ
 بہت پسند آیا۔ اور بابا صاحب سے معافی مانگی۔
 بابا صاحب نے اس کو دُعا دی کہ تیری سات
 پیڑھیاں ملک ہند پر حکومت کریں گی *
 ایک دفعہ آپ پھرتے پھرتے ہردوار کے میلہ میں
 جا پہنچے۔ چند برہمنوں کو دریائے گنگا میں مشرق
 کی طرف صمنہ کر کے درختوں کو پانی دیتے دیکھا۔
 یہ ایک مذہبی رسم تھی۔ اور اس طرح وہ خیال کرتے

تھے۔ کہ پتروں کو پانی پہنچنا ہے۔ نانک نے مغرب
 کی طرف مُخ کر کے یوں ہی پانی اُچھالنا شروع کیا۔
 برہمن ان کو نادان فقیر سمجھے۔ دریافت کیا کہ یہ کیا
 کر رہا ہے؟ نانک نے کہا ”کرتار پور میں میرے
 کھیت ہیں ان کو پانی دیتا ہوں۔“ برہمن ہنس کر
 کہنے لگے ”کیا خوب! سینکڑوں کوس پر پانی کیسے
 پہنچ سکتا ہے؟ نانک نے اس موقع پر یہ عجیب
 نصیحت کی کہ ”اگر اتنی دُور بھی پانی نہ جاسکیگا تو
 تم کس اُمید پر اس دُنیا میں چار چٹو پانی چھڑک
 کر عالمِ عقبے میں اپنے پتروں کو سیراب کر رہے ہو؟“
 پھر چند دوسرے معرفتِ الٰہی کے سنائے جن کو
 سن کر تمام حاضرین ان کے قدم چومنے لگے۔
 کہا جاتا ہے کہ بابا نانک کے شریف کو بھی گئے تھے۔
 انہوں نے ملکِ عرب کی سیر کی تھی۔ چنانچہ حرمِ کعبہ میں
 بیت اللہ کی طرف پیر پھیلا کر سوئے ہوئے تھے کہ
 وہاں کے آدمی ان سے اُبھنے لگے۔ انہوں نے خفگی
 کا باعث دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا ”عقل سے خالی
 شخص! تو خدا کے گھر کی طرف پاؤں کر کے سوتا
 ہے؟“ نانک نے جواب دیا ”میرے خیال میں تو کوئی
 سمت ایسی نہیں جو خدا کا گھر نہ ہو۔ اگر تم کوئی
 ایسا رخ جانتے ہو جس طرف خدا نہیں تو میرے پاؤں
 اسی جانب کر دو“ لوگ یہ باریک نمک سن کر خاموش
 ہو گئے اور اپنا سامنہ لے کر چل دئے۔

بابا نانک نے اپنے ایک چیلے کو جس کا نام لہنا تھا اور قوم کا کھتری اپنا جانشین بنایا۔ بی بی صاحبہ خفا ہوئیں کہ اولاد کو چھوڑ کر یہ مرتبہ غیر کو کیوں دیتے ہو۔ بابا نانک نے کہا۔ ”اس لئے کہ بیٹے میرے فرمانبردار نہیں“۔

بی بی صاحبہ بولیں ”نہیں! وہ تمہاری اطاعت کریں گے“۔

فرش پر ایک ادھ موا چوہا پڑا تھا۔ بابا نانک نے بیٹوں کو حکم دیا کہ اس کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔ مگر کسی نے ہاتھ نہ لگایا۔ آخر لہنا سے کہا اور اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بابا نانک نے کہا کہ یہ ہے میرا اصلی فرزند۔ اور لہنا کو بہت سی دعائیں دیں۔ غرض ان کی جانشینی لہنا کو ملی اور اولاد خاص اس شرف سے محروم رہی۔

بابا نانک کے سیر و سفر کی مدت حیات کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔ آخری وقت میں ضلع گورداسپور کے ایک مقام پر ٹھہر کر وہاں ایک دھرم سالہ بنوایا۔ اور کرتار پور اس کا نام رکھا۔ اسی جگہ جم گئے۔ بال بچوں کو بھی یہیں طلب کر لیا۔ اور چیلوں کو جا بجا سے جمع کیا۔ پھر ان کو چند روز تک وعظ و پند کرتے رہے۔ اسی اثنا میں موت کا پیام آگیا۔ اور ستر برس کی عمر میں دارِ ناپائدار سے عالمِ آخرت کی طرف کوچ کیا۔ موصداۃ خیالات اور

صلح کل تعلیم کے باعث ہر مذہب و ملت کے آدمی ان کے ایکساں معتقد تھے۔ ہندو مسلمان دونوں ان سے برابر کی محبت کرتے تھے۔ وفات کے بعد لاش پر جھگڑا ہوا۔ ہندو آگ میں پھونکنے اور مسلمان کفن و دفن کا سر انجام کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ جانین میں لڑائی ہوئی۔ خونریزی کی نوبت آئی۔ مگر جب لاش پر سے چادر ہٹائی گئی تو وہاں کچھ بھی نہ دیکھا۔ لاچار ہو کر چادر کو آدھا بانٹ کر لیا۔ ہندوؤں نے اپنا نصف حصہ نذر آتش کیا۔ اور مسلمانوں نے آدھی چادر کو سپرد خاک۔ لیکن گردش زمانہ نے اس بزرگ ولی کا نشان مزار بھی محو کر ڈالا۔ بابا نانک کی سادہ اور ان کا اسلامی مقبرہ دونوں دریائے راوی کو اپنی قدیموسی کا شرف دیتے تھے۔ مگر اس چالپوس دشمن یعنی دریائے راوی نے اس شعر کا مفہوم سچ کر دکھایا کہ

بر تواضع ہائے دشمن تکبہ کردن ابھی ست

پائے بوس سیل از پا آگند دیوار را
دریا میں طغیانی آئی اور دونوں عمارتوں کو بہا کر لے گئی۔ رہے نام اللہ کا +

گرد نانک کی تعلیم و تلقین کا صاف و شفاف مطلع ان کے بعد جلد ہی مکدر ہو گیا۔ اور ان کے چیلوں کا فرقہ جو سکھ کہلاتا تھا درویشی کو ترک کر کے پہلگری اور فاتحانہ زندگی پر لٹو ہوا۔ یہاں تک کہ اس گروہ

نے بتدریج زور پکڑ کر ملک پنجاب پر اپنا تسلط
جایا۔ اور سالہا سال حکومت و جہان بینی کا مزا لوٹا۔
بابا نانک کی ولادت ۱۵۶۹ء میں اور وفات ۱۵۳۹ء
میں ہوئی *



فرانسس بیکن

ولادت :- فرانسس بیکن ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو
شہر لندن کے محلہ اسٹرینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ
”سرنکولس بیکن“ پہلے لارڈ کیپر تھا اور پھر چینسلر
بھی بنا دیا گیا۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں تقریباً بیس
سال سرنکولس بیکن ان خدمات کو بخوبی انجام دیتا رہا۔
ملکہ کے مزاج میں اس کو رسوخ حاصل تھا۔ کیونکہ
وہ ایک نہایت دیانتدار اور فہمیدہ وزیر تھا۔ اور اس
میں بڑی خوبی یہ تھی کہ دولت و مرتبہ نے اس کے
مزاج میں کوئی بڑا تغیر نہیں پیدا کیا تھا۔ سرنکولس
بیکن کی دوسری بی بی ”این“ اس کے دو بیٹوں کی
ماں بنی ایک ”اینتھونی“ اور دوسرا ”فرانسس“ جو آخر
میں ”لارڈ فرانسس بیکن“ کے نام سے نامدار اور علم و
دولت کی دنیا کا ایک سربرآوردہ فرد ہوا *
بقول کسے کہ ”ہونہار ہر دماغ کے چمکنے چمکنے پات“
فرانسس میں لڑکپن ہی سے اعلیٰ دماغی جوہر کے

آثار نمایاں تھے۔ ملکہ الزبتھ نہایت بیدار مغز خاتون اور فرمانروائی کا خاص ملکہ رکھتی تھی۔ وہ اکثر اوقات اس سے باتیں کیا کرتی اور اس کی حاضر جوابی سے مسرور ہوتی۔ ملکہ نے ایک مرتبہ فرانس سے دریافت فرمایا کہ ”تمہاری کتنی عمر ہے؟“

فرانس نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔ ”حضور عالیہ۔ یہ غلام آپ کی تخت نشینی سے دو سال قبل پیدا ہوا ہے۔“ ملکہ اس کی تیزی طبع کا رنگ ملاحظہ کر کے اکثر اسے ”میرا چھوٹا لارڈ کیپر“ کہہ کر بلایا کرتی تھیں۔

ابتدائی تعلیم پانے کے بعد فرانس لیکن بارہ سال کی عمر میں کیمبرج کے ٹرینیٹی کالج کے طلبہ میں شامل اور ڈاکٹر ”وائٹ گفٹ“ کے سپرد ہوا۔ ڈاکٹر مذکور اخیر میں کنٹر بری کے لاٹ پادری ہو گئے تھے۔ فرانس لیکن چار سال کی قلیل مدت میں اس زمانہ کے علم معقول کی خواندگی مکمل کر چکا۔ اور اس کی حیرت انگیز ذہانت دُنیا پر اس پیرایہ میں ظاہر ہوئی کہ اس نے حکیم ارسطاطالیس کے اجتہادات اور قدیم فلسفہ کے نظام میں غلطیاں نکال کر تجویز کیا کہ اس وقت سے انہیں سو برس پیشتر جس علمی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی اب اس کو منہدم کر کے نئی بنیاد پر جدید عمارت بنانے کی ضرورت ہے۔ اور اس نئی عمارت کی تعمیر میں مصالحہ بھی نیا ہونا چاہئے۔

فرانسس بیکن کے زمانہ میں مشائی حکماء کا فلسفہ نہایت زور شور سے رائج تھا۔ بیکن نے اس کو منسوخ کر کے اپنا نیا فلسفہ ایجاد کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال اس کے دل میں خود بخود نہ آیا ہو۔ بلکہ اس نے اپنے نامور ہمنام ”فرائر بیکن“ کی تصانیف پڑھ کر ایسی رائے قائم کی ہو۔ کیونکہ ان دونوں کے اصول بہت متشابہ اور مشکل سے توارد یا اتفاق کہلا سکتے ہیں۔ جن کی نظر علوم فلسفہ پر حاوی ہے وہ فرانسس بیکن کی کتاب ”نوم آرگینم“ اور ”فرائر بیکن“ کی تصنیف ”اپس میگم“ کے مسائل اور خیالات میں عجیب قسم کی یکسانیت پاتے ہیں۔ چنانچہ ”ڈاکٹر ٹیلر“ کا قول ہے کہ اگر ”روجر بیکن“ کی تصانیف بھی اسی آسانی سے حاصل ہو سکتیں جس سہولت سے ”فرانسس بیکن“ کی کتابیں میسر آتی ہیں۔ تو اس میں شک نہ تھا کہ نئے فلسفہ کا موجد پیدا کرنے کے باب میں آکسفورڈ کیمبرج کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

گو کچھ بھی ہو لیکن فرانسس بیکن کی لیاقت مسلم تھی۔ اُس کا یہ کام کہ اُس نے مدتوں کے طریقہ تعلیم کی بیڑیاں توڑ دیں۔ دلوں میں جرہ پکڑے ہوئے تعصب کا مقابلہ کیا۔ اور تمام یورپ کے علماء کو یقین دلا دیا کہ اس وقت سے پہلے انہوں نے جتنی محنت کی ہے سب بے سود تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اور اس کے واسطے غیر معمولی اخلاقی طاقت اور ذہانت درکار تھی۔ فلسفہ کی تاریخ میں فرانسس بیکن کی کامیابی

ایک اہم اور بے نظیر شے ہے۔ اس کو اس کا اخلاقی
 اعجاز کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ کیونکہ اس نے
 قدیم فلسفہ کو معدوم ہونے اور جدید فلسفہ کو ترقی کرتے
 خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور اس کے بعد آنے
 والی نسل نے یورپ میں نئے فلسفہ ہی کا دور دورہ
 مشاہدہ کیا۔

بیکن - یونیورسٹی سے چھوٹ کر دستور زمانہ کے موافق
 سیاحت پر روانہ ہوا۔ وہ برٹش سفیر "سرامیس پالٹ"
 کے ہمراہ فرانس کے دار الملک "پیرس" کو گیا۔ اور
 سفیر کو اپنے حال پر اس قدر مہربان بنا لیا کہ سفیر
 نے اس کو ایک اہم سیاسی راز کے متعلق گفتگو کرنے
 کے لئے ملکہ الزبتھ کی خدمت میں ارسال کیا۔ بیکن
 اس خدمت کو بڑی عمدگی اور کامیابی سے انجام دیکر
 پھر فرانس پہنچا۔ اور یورپ کی سیاحت سے اپنے معلومات
 میں اضافہ کرنے لگا۔ طبیعت غور پسند اور نتیجہ اخذ
 کرنے کی شائق تو تھی ہی۔ دوران سیاحت میں ہر ملک
 و قوم کے رسم و رواج - اخلاق و معاشرت - نظام حکومت
 اور بادشاہوں کے اطوار و عادات پر غائر نظر ڈالتا۔
 اور ان کی نسبت اپنی خاص رائے قائم کرتا رہتا۔
 ابھی اس کی زندگی کا اُنیسواں ہی سال تھا کہ اس
 نے ایک کتاب "حالات یورپ" نامی لکھ کر شائع کی۔
 اور دنیا میں اپنی قوت فیصلہ کی پختگی کا ڈنکا بجا دیا۔
 لارڈ کیپر فرانس بیکن کو بہنی اور اولاد سے بہت

زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس نے ایک بڑی مقدار دولت کی اس غرض سے جمع کی تھی کہ اس کا عالم اور باکمال نور نظر ”فرانس“ اپنی زندگی آرام و بے فکری کے ساتھ بسر کر کے علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ لیکن فرانس کی ہر قسمی سے لارڈ کیپر بغیر کوئی وصیت نامہ لکھے ہوئے فوت ہو گیا۔ اور اس کو پوری ترکہ میں بہت قلیل جائداد اور دولت بچے آئی۔ فرانس اپنے سامان معاش کے بارہ میں گورنمنٹ کی مدد حاصل نہ کر سکا۔ اگرچہ خاندانی حقوق اس کو مستحق بناتے تھے۔ لیکن شومی طالع دیکھتے کہ اس کا خالو ”ولیم سل لارڈ برلے“ تک جو وزیر اعظم تھا فرانس کا حامی اور دشگیر نہ ہوا۔ بلکہ وہ اپنے بیٹے ”رابرٹ“ کو عروج دلانے کے درپے تھا۔ اور جانتا تھا کہ ”بیکن“ کے سرکاری خدمات پر آنے سے رابرٹ کا رنگ پھیکا پڑ جائیگا۔ ”فرانس بیکن“ جب ہر طرف سے کوشش کر کے مایوس ہو چکا تو اس نے قانون کا پیشہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ اور جلد کامیاب وکیل بن گیا۔ موکل اور حکام سب اس کے اخلاق کی مدح کرتے اور اس کو عزیز رکھتے تھے اور قانون دانی کے لحاظ سے بھی وہ یکتائے روزگار تھا۔

۱۵۷۱ء میں فرانس بیکن کو شاہی کونسل کا عہدہ ملا۔ یہ اعزازی منصب تھا۔ کوئی تنخواہ نہ تھی۔ آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنے کی غرض سے اس کو اپنے

ذی رنوخ، عزیزوں کی خوشامد کرنی پڑی۔ تاکہ سخت محنت سے نجات ملے۔ "لارڈ برلے" کا بھی دل اب اس کی حالت پر پیچھا اور اسے سٹار چیمبر کی رجسٹری دلا دی۔ فرانسس بیکن بیرسٹری کے ساتھ ساتھ اپنے فلسفی مشاغل بھی نباہ رہا تھا۔ وہ فلاسفہ مشائین کی تعلیم کو محو کرنے کا خیال پیش نظر رکھتا تھا۔ اور اس کوشش سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ شاہی کونسل بننے ہی اس نے اپنی بڑی ضخیم تصنیف کا مسودہ شائع کرنا چاہا۔ مگر یہ مضمون ضائع ہو گیا۔ اور اچھا ہوا کہ وہ شائع نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس میں کوئی بات نہیں نکلتی تھی * ۹۳ھ

۹۳ھ میں بیکن ڈل سکس کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر مقرر ہوا اور تقریر کرنے میں بہت جلد کامیابی حاصل کر لی۔ یہاں اس کو اس کوشش میں بھی ایک حد تک کامیابی ہوئی کہ وہ گورنمنٹ اور عوام دونوں کو اپنی روش سے راضی رکھ سکے۔ مگر ایک بار جب وطن کے جوش میں اس نے گورنمنٹ کے خلاف تقریر کر کے ملکہ اور تمام وزرا کو اپنی جانب سے برہم بنا دیا۔ چنانچہ اخیر میں اس کو بے جا جزی معافی طلب کرتے بنی اور پھر کبھی ایسی جرأت نہ کی * بیکن اپنے ذی اقتدار عزیزوں کی طرف سے بارہ برس خوشامد و خدمت کر کے مایوس ہو گیا۔ اس نے یقین کر لیا کہ ان لوگوں سے اس کو کبھی کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔

وہ اب کوئی اور یار و مددگار تلاش کرنے لگا۔ اس وقت ملکہ الزبتھ کے دربار میں ”رابرٹ ڈیویروارل آف اسکس“ ایک نوجوان شریف - رئیس - شجاع - خوش خلق - تربیت یافتہ - اور نہایت من چلا آدمی روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا۔ اس کے سامنے تمام وزرا اور ارکان دولت پست ہو گئے تھے۔ ملکہ کے مزاج میں ”ارل آف اسکس“ کا دخل اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ جو چاہتا اس سے منوا لیتا۔ ”ارل آف اسکس“ میں ایک بے نظیر خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحت اور دست نگر لوگوں سے حد درجہ کا شریفانہ سلوک کیا کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ان کے دلوں میں اپنی شکرگزاری اور محبت کا نقش جما دے۔ بیکن کے علمی اوصاف پر اس کی توجہ ہوئی۔ دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ ”ارل آف اسکس“ نے بیکن کو خوشحال اور فارغ البال بنانے کی حد سے بڑھ کر کوشش کی۔ اس کے کام کو اپنا ہی کام سمجھا۔ لیکن

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیوان نشنہ ے آرد سکندر را
والی مثل ہوئی۔ ۹۵ھ میں اٹرنی جنرل کا عہدہ خالی ہوا۔ بیکن کو نہ مل سکا ڈیڑھ برس تک ارل اس کے واسطے پوری کوشش کرتا رہا۔ مگر پھر بھی ناکامی ہی ہوئی۔ تو اسکس نے بیکن کو ایک قطعہ اراضی بطور جاگیر کے نذر کر دیا۔ یہ اراضی مقام ٹوکنہم میں واقع۔ اور اس کی سالانہ آمدنی دو ہزار پونڈ تھی۔ اس

جاگیر نے بیکن کو تھوڑی سی تسکین دلا دی اور اب وہ فکرِ معاش کے بوجھ سے کچھ ہلکا ہو گیا *
 ۱۷۹۷ء کے آغاز میں بیکن کی ایک چھوٹی سی کتاب ”مضامین“ کی شائع ہوئی۔ وہ بعد میں اس کتاب کے اندر اور بھی اضافہ کرتا رہا۔ یہ کتاب عام طور سے مقبول ہوئی۔ چند ماہ میں طبعِ اول کے نسخے ختم ہو گئے اور دوبارہ چھاپنے کی ضرورت پڑی۔ اس کا ترجمہ ابطالی۔ فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں بھی ہو گیا۔ اس نے مصنف کے علم و کمال کا شہرہ قائم کرایا۔ بیکن شہرت کی ترقی ہوئی تو آمدنی پہلے سے بھی گھٹ گئی۔ بیکن کی پریشاں حالی کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے کرنا چاہئے کہ ایک مرتبہ ایک سنار نے اس کو تین سو پونڈ نہ ادا کرنے کے معاوضہ میں گرفتار کرا دیا *
 ”لارڈ اسکس“ بیکن کی بہتری میں ہمیشہ کوشاں رہا۔

وہ اپنی غیبت میں اپنے دوستوں کو ہدایت کر جاتا کہ بیکن کا خیال رکھنا۔ سپین کے سفر پر جاتے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ اور اس سفر سے جب وہ فتمندی اور کامیابی حاصل کر کے واپس آیا تو ملک میں رسوخ و ناموری پائی۔ ”لارڈ اسکس“ کی یہ عزت اس کے حاسدوں سے نہ دیکھی گئی۔ وہ اس کو ذلیل اور تنہا کرنے کے پیچھے پڑ گئے۔ لارڈ اسکس کا غرور اور بھی اُس کی ذلت کا موجب ہوا۔ پہلے سے زیادہ غرور ترقیِ مناصب کے بعد بڑھا۔ اور دشمنوں کی

دشمنی بھی اس وجہ سے ترقی کر گئی *
 اس زمانہ میں بیکن کو شادی کا شوق چڑایا۔ ایک
 دولتمند مگر سخت مزاج اور وہی بیوہ سے عقد کا پیام
 دیا۔ مگر لیڈی صاحبہ نے بیکن کی درخواست رو کر دی۔
 اور اس کے رقیب ”سرایڈورڈ کوک“ سے شادی کر
 کے اس کی بڑی گت بنائی۔ اگرچہ اس ناکامی سے
 بیکن کو صدمہ ہوا۔ لیکن رقیب کی دُرگت بنتے دیکھ کر
 وہ اپنے اس آفت سے بچ جانے اور دشمن کی
 مصیبت پر خوش ہو سکتا تھا *
 ”لارڈ اسکس“ کی ترقی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور

اس کا انجام زوال ہونا لازمی تھا۔ دربار میں جتنے
 ارکان دولت تھے اس کی بد مزاجی کے شاکی تھے۔ یہ
 شکایت برا رنگ لائی۔ آخر اس کا اقتدار گھٹنے لگا۔
 اس آفت سے بچنے اور پھر اپنا اثر بڑھانے کے لئے
 لارڈ نے بیکن کو اپنا مشیر اور ہمدرد بنایا۔ بیکن نے
 اس کو آئرلینڈ کی گورنری منظور کرنے سے منع کیا۔
 مگر وہ وہاں چلا گیا۔ مہم سر نہ ہو سکی اور مزید غلطی
 اس سے یہ ہوئی کہ ملکہ کی عنایتوں کے اعتماد پر
 وہ آئرلینڈ سے بلا اجازت واپس چلا آیا۔ دربار میں
 پہنچا۔ تو زبردستی ہوئی اور سب عمدے چھن گئے۔ گھر
 میں نظر بند کر کے بٹھا دیا گیا۔ بیکن نے پہلے بڑی
 کوشش کی کہ لارڈ اسکس کی ملکہ الزبتھ سے سفارش
 اور صفائی کرا دے۔ مگر ملکہ کی شاہی بد مزاجی اور لارڈ

کی مغرورانہ تمکنت نے ایک بات بھی بننے نہ دی۔ آخر کار بیکن یہ دیکھ کر کہ لارڈ کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے مرتب اور سچے دوست سے پھر گیا۔ اور اس کے خلاف سرکاری وکیل کی حیثیت سے اس کو سزا دلانے کا پیروکار بن گیا۔

لارڈ اسکس زمانے کی اس نیرنگی سے اتنا دل شکستہ ہوا کہ اس نے علانیہ بغاوت کر دی۔ اور اب اس کا جرم قابل سزائے قتل ہو گیا۔ یہ سزا بیکن ہی نے اسے دلوائی۔ اور ایسی زبردست بحث کے بعد کہ مجرم کو معافی ملنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رکھی۔ مگر لارڈ اسکس کی شرافت پر آفرین ہے کہ وہ بیکن کی تقریر سن کر صرف اتنا کہ کے خاموش ہو گیا کہ یہ انتہا درجہ کا ظلم اور بے وفائی ہے۔ آہ ایسے نازک وقت میں جس کی تلخی موت کی تلخی سے بھی بڑھ کر تھی۔ وہ اپنے احسان فراموش دوست کو صاف طور سے احسان فراموش اور محن کش نہ کہ سکا۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کی شرافت کا ثبوت ہے۔

لارڈ اسکس کو پھانسی مل گئی۔ بیکن نے اس کو بچانے کی ذرا بھی سعی نہ کی۔ عوام اس بات پر ناراض ہوئے۔ اور گورنمنٹ نے ان کا غصہ دھبہ کرنے کے لئے مقدمہ کی کارروائی کا جائزہ اور حق ہونا ثابت کرنا چاہا۔ اور یہ کام بھی بیکن ہی کو سپرد ہوا۔ کیونکہ اس کی اعلیٰ انشا پردازی اور زور قلم سے ملکہ بخوبی

واقف تھی۔ افسوس ہے کہ بیکن نے کمال، سنگدلی سے اپنے محسن کی جان لینے کے علاوہ اس کا نام بھی دُنیا سے مٹانا چاہا۔ مگر اس کی یہ کمینگی دُنیا پر بچھی نہ رہی۔ ہر شخص اس کو لعنت و ملامت کرتا تھا۔ کئی بار وہ قتل ہونے سے بچا۔ اس نے ایک رسالہ گورنمنٹ کی طرف سے لارڈ اسکس کے واجب القتل مجرم ہونے کے ثبوت میں لکھا۔ اور گو پُر زور دلائل کے ساتھ یہ امر ثابت کر دکھایا کہ اس کا قتل حق بجانب تھا۔ پھر بھی جیسے الفاظ اس نے اپنے ایک پیچے سرپرست اور محسن کی نسبت لکھے وہ شاید کسی رحم دل دشمن کے قلم سے بھی نہ نکلتے۔ اور اس کے دامن سے یہ کمینگی کا دھبہ کبھی نہ چھوٹ سکیگا۔

ملکہ الزبتھ کی زندگی تک اس کام کی وجہ سے لوگوں کو بیکن کے ساتھ اظہار ناراضی کرنے کا موقع نہ ملا۔ مگر شاہ جیمس اول کے تخت نشین ہوتے ہی صورت معاملات دگرگوں ہو گئی۔ شاہ موصوف زمانہ ولیعهدی میں لارڈ اسکس کا ہوا خواہ اور اس پر مہربان تھا۔ حصول تخت و تاج کے بعد اس نے "اسکس" کے وارثوں اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کیا۔ اور جن لوگوں نے مصیبت کے زمانہ میں اسکس کا ساتھ دیا تھا ان پر بھی عنایت شاہانہ مبذول کی۔ لوگوں کو اسکس کا صحیح قصہ لکھنے کی آزادی ملی۔ اور بیکن پر پھٹکار پڑنے لگی۔ بیکن نے کئی معذرت نامے بھی

شائع کیے۔ مگر بے سود۔ لوگ اس کو برا بھلا کہنے سے باز نہ رہے *۔

شاہ جیمس اول میں جہاں عیوب تھے وہیں ایک بڑی خوبی تھی کہ وہ خود عالم اور علم دوست تھا۔ بیکن کی علمی قابلیت اس کی نگاہ قدردانی سے محروم نہ رہی اور اس کو اس عہد میں اچھی ترقی نصیب ہوئی۔ بیکن نے ایک مالدار سوداگر کی حسین بیٹی سے عقد کرنا چاہا۔ اور سرکا خطاب حاصل کرنے کے لئے اپنے خال زاد بھائی "رابرٹ سسل" کی خوشام کرنے لگا۔ چنانچہ خطاب ملتے ہی سرفرانس بیکن اپنی مہرجال محبوبہ کو بیاہ لایا۔ شاہ جیمس اول کی شانہ عنایتوں نے بیکن کو ۱۶۰۴ء میں شاہی کونسل بنا دیا۔ اس عہدہ کی تنخواہ ۴۰ پونڈ سالانہ مقرر ہوئی۔ اور ۶۰ پونڈ پنشن ملنے لگی۔ ۱۶۰۶ء میں وہ سالیشر جنرل اور ۱۶۱۲ء میں اٹرنی جنرل ہو گیا۔ پارلیمنٹ میں بھی شہرت حاصل کرتا رہا۔ اور خاص کر انگریز اور سکاٹ لینڈ کے متحدہ کرنے میں اس کی کوشش بار آور ہوئی اور یہ بات بادشاہ وقت کو دل سے منظور تھی۔ بیکن پارلیمنٹ میں اپنے فرائض پوری سرگرمی کے ساتھ ادا کرنے کے باوجود علم و فلسفہ کی خدمت کے لئے بھی ضرور وقت نکالتا تھا۔ اس زمانہ میں اس نے ایک کتاب "ادوانسمنٹ آف لرننگ" (ترقی علم) کے نام سے شائع کرائی۔ اس میں مصنف نے اپنے

زمانہ کی علمی دُنیا کا مبلغ علم جانچنا چاہا ہے۔ اور اک
کی وسیع مملکت کے مفتوح اور غیر مفتوح علاقوں کی
تشریح کی ہے۔ اور اور غیر معلوم مقامات کی جستجو
کی سمتیں واضح کی ہیں۔ آخر میں نئی ایجادوں کا
سلسلہ قائم کرنے کا طریقہ اور اس کی تدبیریں بتائی
ہیں۔ اور دکھایا ہے کہ جو علم اب تک حاصل ہو چکا
ہے۔ اس کو مکمل بنانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔
پہلے یہ کتاب انگریزی زبان ہی میں پھٹی۔ بعد میں
مصنف نے چاہا کہ تمام یورپ اس سے نفع اٹھائے
اور کیمبرج کے استاد ڈاکٹر ”پلیفیر“ کو اس کا لاطینی
میں ترجمہ کرنے کی ترغیب دی مگر ڈاکٹر صاحب پرانے
خیال کے بزرگ اور محض سیدھے سادے پڑھے لکھے
شخص تھے۔ ترجمہ میں وہ زبان کی عمدگی کا تو لحاظ
کرتے رہے لیکن مصنف کے زور قلم کی کچھ پروا
نہ کی۔ بیکن نمونہ کے چند صفحے دیکھ کر خاموش ہو رہا۔
اور پھر اس نے ^{۱۶۰۹} سال اللہ میں خود ہی اس کا ترجمہ
لاطینی میں کیا جو شائع ہو گیا ہے *۔

^{۱۶۰۹} سال میں بیکن نے اپنی کتاب ”ویژڈم آن دی
ایشنس“ (قدما کی عقل) شائع کی۔ اس سے مصنف
کی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی اور تصوّر کی رسائی کا
ثبوت ملتا ہے۔ اس کتاب میں بیکن نے یہ ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم یونانی دیوتاؤں کے
قصے استعارہ کے طور پر مفید اخلاقی۔ طبعی اور سیاسی

نصائح پر مشتمل ہیں۔ اور اگرچہ بیکن کی اس نئی اُتچ سے اتفاق تو کمونٹی نہ کر سکا مگر خوش سب ہو گئے *
 بیکن اسی عرصہ میں انگلستان کے قوانین کو بھی ترتیب دیتا تھا۔ پھر اس سخت پُر محنت کام کے ساتھ ہی اپنی سب سے بڑی تصنیف کو بھی آہستہ آہستہ مکمل کر رہا تھا *
 ۱۶۱۳ء میں بیکن کا خالو اور بڑا سخت دشمن

ولیم سسل ارل آف سالبری مر گیا۔ اور اس کی جگہ پر "رابرٹ کار" ارل آف سامرٹ کے خطاب سے مشرف ہو کر مامور کیا گیا۔ ان دنوں شاہ جیمس اول کے دربار میں ایک اور نو عمر امیر "جارج ولیر" ترقی اور رسوخ کی منزلیں آہستہ آہستہ طے کر رہا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی نظر عنایت اس پر بہت زیادہ تھی۔ بیکن پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا کہ دربار میں "ولیر" کی آئندہ ترقی سب پر بازی لے جائیگی۔ چنانچہ اور لوگ "ارل آف سامرٹ" کی خوشامد خوری کرتے رہے اور بیکن نے "ولیر" سے ربط بڑھایا۔ آخر کار جب ولیر نے سامرٹ کو ہٹا کر اس کی جگہ لے لی اور ڈیوک آف بکنگھم کا خطاب پایا تو اس کی مدد سے بیکن بھی ۱۶۱۶ء میں پریوی کونسل کے اندر داخل ہو گیا *
 "ولیر" خوشامد پسند تھا اور بیکن غرضمند۔ بیکن کی

نظر لارڈ چیپسلر کے منصب پر لگی تھی اور وہ اس کے حصول کے لئے ہر طرح کی ذلت اپنے اوپر گوارا کر

رہا تھا۔ جب "لارڈ چینسلر اگرٹن" کی موت کا وقت نزدیک آیا بیکن نے ویلر کی دربار داری اور بڑھا دی۔ اور طرح طرح کی سازشیں کیں۔ جتنے کہ ۱۶۱۷ء میں "لارڈ بریکلی" کے مرتے ہی بیکن کو وہ منجوس کامیابی حاصل ہو گئی جس کے واسطے وہ اپنے ضمیر کا خون کر چکا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ بہت سے فوائد اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کا نہ حاصل ہونا ہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ اور ان کے حصول میں شامت کا راز محفی ہوا کرتا ہے۔ الغرض بیکن اب لارڈ کیپر ہو گیا۔ اور ۱۶۱۹ء میں دربار انگلستان کا چینسلر بن کر پہلے "یرن ویرولم" اور پھر "وائی کونٹ سینٹ الینس" کے خطابات سے مفخر و ممتاز ہوا۔ ۱۶۱۷ء میں پارلیمنٹ کھلنے کا پہلا دن تھا۔ آج بیکن بڑے جلوس سے "وسٹ منسٹر ہال" میں پہنچا۔ اور اپنی عدالت میں آکر اس نے ایک بڑی طویل تقریر کی جس میں اپنے فرائض منصبی بخوبی پورے کرنے کا ثبوت دے دیا۔ اور اس ساعت سعید میں جس کو گروہ عوام اور خود وہ بھی بیحد مبارک سمجھتا تھا۔ بیکن نے شریف علمی مشاغل پر محبت بھری نگاہ ڈالی۔ کیونکہ اب گویا وہ اُن سے جدا ہو رہا تھا۔ مگر اس نے یہ کہا کہ تعطیلوں اور فرصت کے آیام میں اس کا کام علمی مشغلے ہونگے جن کی طرف وہ قدرۃً مائل ہے۔

بیکن بختے عرصے تک سلطنت کی مہر پر قابض رہا۔
 اُس زمانہ میں اندر اور باہر غام بد نظمی پھیلی رہی۔
 انگلستان کی خارجی حکمت عملی پر تمام یورپ ہنستا تھا۔
 اندرونی حالت ایسی ابتر تھی کہ رعایا ٹکس کی بھرمار
 سے تنگ آ گئی تھی۔ ہر طریقہ سے روپیہ وصول
 کیا جاتا تھا۔ اور یہ ظلم صرف اس لئے ہوتا تھا کہ
 ڈیوک آف بکنگھم اور اس کے متوسلین اور عزیزوں
 کی جیبیں بھری جائیں۔ بیکن انصاف کیا خاک کرتا
 جبکہ اس کے اکثر فیصلے ڈیوک آف بکنگھم کی ہدایت
 کے موافق لکھے جاتے تھے۔ پھر ایک شخص جو دوسروں
 کی خاطر سے خلاف دیانت کام کرنے کو عیب نہ جانے
 وہ اپنے لئے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع کیوں خالی جانے
 دیتا۔ بیکن نے رشوتیں لیکر ایک لاکھ پونڈ کے قریب
 ناجائز ذریعہ سے حاصل کئے۔ شاہ جیمس اول کے
 زمانے کی پہلی اور دوسری پارلیمنٹوں کے مابین جو عرصہ
 گزرا اس وقت انگلستان کی حکومت مطلق العنان شخصی
 حکومت رہی۔ لارڈ کیمپر کا ستارہ اس دور میں خوب
 عروج پر تھا۔ اعلیٰ منصب نے اس کے علم و کمال
 کو اور چمکا دیا تھا۔ اہل مقدمات لٹتے تھے مگر ان
 کی فریاد کون سنتا۔ مجبوراً دل ہی دل میں کوس کوس
 کے چپ ہو رہتے تھے *

۱۶۲۱ء میں بیکن نے اپنی سب سے بڑی اور
 اہم تصنیف کتاب ”نووم ارگینم“ شائع کی۔ یہی کتاب

ہے جس نے بیکن کو قدیم فلسفہ کا ناسخ اور جدید فلسفہ کا موجد قرار دیا۔ بیکن نے اس کتاب کی تالیف و تصنیف پر بارہ سال محنت کی۔ اس میں اس نے استقرائی منطق کے اصول ظاہر کئے ہیں اور بتایا ہے کہ نتیجہ ہمیشہ ایسے واقعات سے نکالنا چاہئے جو ثابت اور واضح ہوں۔ قیاسی اور خیالی باتوں کے ذریعے کوئی رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں۔ بیکن جس کام میں مصروف تھا وہ اس کتاب کے اشاعت پاتے ہی تکمیل کو پہنچ گیا۔ قدیم نظام فلسفہ کا شاندار ایوان بیکن کے دماغ کا دی کی ضربوں سے گر کر خاک میں مل گیا۔ اور نئے فلسفہ کی مستحکم تعمیر کی دیواریں نیو سے ایک نمایاں بلندی تک بن کر تیار ہو گئیں۔ اب بیکن کی علمی شہرت اور دنیاوی زندگی کی کامیابی یعنی دولت و ثروت پایہ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ علم و کمال تو دولت لازوال ہے۔ بیکن دنیاوی عروج میں تکملہ کے بعد تنزل ہونا قدرتی امر تھا۔ یورپ بھر میں اس کی کتاب ”نوم آرگینم“ کی تعریف ہو رہی ہے۔ ”دنیاوی اعزاز میں اس کو وائیکونٹ سینٹ الہنس“ کا خطاب ملا ہے۔ خطاب کی سند پر شہزادہ ویلز ولیم سلطنت کی گواہی ہے۔ اور خلعت ملنے کی رسم بڑی دھوم سے عمل میں لائی گئی ہے۔ مگر اس ترقی کے تنزل میں بدلنے کا وقت بھی سر پر کھڑا ہے اور ان رسوم کے چند ہی ہفتہ بعد لارڈ بیکن کو معلوم

ہو جاتا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں اس نے
اپنی ایمانداری اور دیانت کے دامن پر دھبہ لگایا -
آزادی کی پُر امن سرکار سے الگ ہوا - دوستی اور
اجسانندی کا مقدس رشتہ توڑا - اور درباری سازشوں
کی ذلت آمیز کارروائی میں آلودہ بنا - وہ سب محض
بے حقیقت اور وبال جان چیزیں تھیں +

شاہ جیمس اول کی سادہ لوحی اس کی لیاقت اور
علمی قابلیت سے دور ہونے کی جگہ اور بڑھ گئی تھی -
خود غرض درباریوں نے اسے دھوکا دیکر یہ خیال دلا دیا
کہ وہ کسی پوشیدہ غیبی قوت کی مدد سے تاج و تخت
انگلستان پر قابض ہے اور اس کے حکم سے سرتابی
گویا فرمان ایزدی کی مخالفت ہے - بادشاہ کا دماغ
چل گیا - وہ رعایا کو غلام اور پارلیمنٹ کو اپنی مخالف
قوت تصور کرنے لگا - اسے خیال ہوا کہ اپنی ذات
سے سلطنت کا انتظام کرے - پارلیمنٹ کو الگ
رکھ دے - ڈیوک آف بکنگھم کی مدد سے خلافت
قانون ٹکس جاری کر دئے - ڈیوک کی ماں اپنے
بیٹے پر حاوی اور بڑی چالباز عورت تھی - دربار شاہی
رشوت خواروں اور فاصبوں کا مجمع بن گیا تھا - رعایا
مفلس ہوتی جاتی تھی - بادشاہ کا خزانہ خالی تھا - ظالم
وزیر و مشیر روپیہ خود لوٹ کھاتے - اور بدنامی شاہ
کے سر ڈالتے جاتے - پارلیمنٹ چھ برس تک خزانہ
کے افلاس کا کچھ بندوبست نہ کر سکی تو بمجبوری اس

کو درخواست کیا گیا اور نئی پارلیمنٹ جمع ہوئی۔ اس پارلیمنٹ نے خزانہ کے لئے روپیہ کا انتظام کیا اور ساتھ ہی اس افلاس اور رعایا کی بربادی کے اسباب پر بھی غور کرنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ درباری امرا و وزرا خوب خیانتیں کرتے ہیں اور ظلم سے ملک کو لوٹے کھاتے ہیں۔ بہت سے نامور ارکان سلطنت جرم خیانت میں آلودہ پائے گئے اور بیکن بھی رشوت خانی اور بے ایمانی میں مبتلا نکلا۔ پارلیمنٹ کی کیٹی تحقیقات نے بادشاہ کو رپورٹ کی کہ چینسلر صاحب پر بے ایمانی کا الزام ثابت ہوتا ہے۔ اور شاہ نے ہاؤس آف کامنس میں کہلا بھیجا کہ ”ہم کو افسوس ہے کہ اتنے بڑے عالی مرتبہ شخص سے ایسی خطائیں سرزد ہوں“ یعنی ہم مجرم کو قانون کے پنجم سے بچانا نہیں چاہتے۔

دار العوام نے اسی دن دار الامرا سے مشورہ لے کر لارڈ بیکن پر فرد قرار داد جرم لگا دی۔ بیکن جلسہ میں موجود نہ تھا۔ گھر پر اسے خبر ملی۔ بادشاہ کے حکم سے ڈیوک آف بنگھم اس کے پاس آیا تو اسے بیدار منوم اور بدحواس پایا۔ جرائم کی تعداد ۲۳ تک پہنچ چکی تھی۔ اور تحقیقات زور سے ہوتی تھی کہ بادشاہ نے تین ہفتہ کے لئے پارلیمنٹ بند کر دی۔ بیکن اس فرصت کو غنیمت جانکر بادشاہ کی خدمت میں پہنچا اور عفو تقصیر کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے انکار کر دیا۔

اور کہا کہ، تم جرموں کا اقبال کر لو تو اپنے امکان بھر میں تمہاری سزا گدانا میں کوشش کرونگا * پارلیمنٹ کے پھر کھلتے ہی تحقیقات شروع ہو گئی۔ بیکن نے تحریری اقبال نامہ جرائم کا بھیج دیا۔ اس کے دوسرے دن وسٹ منسٹر ہال میں محکم منایا گیا۔ بیکن سخت غلاط کے باعث حاضری سے معاف رکھا گیا۔ حکم کیا تھا۔ نہایت سخت سزا۔ چالیس ہزار پونڈ جرمانہ۔ اور قید جس کی ميعاد کا تقرر بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ پارلیمنٹ کی ممبری اور دیگر سرکاری عہدوں سے قطعاً علیحدگی اور پھر آئندہ عمر بھر کبھی دربار کے پاس نہ پھٹکنے کی قدغن۔ لیکن یہ سزا فوراً ہی گھٹا دی گئی۔ قید خانے میں جانا تو پڑا مگر دوسرے ہی دن رہائی کا حکم آ گیا۔ اور کچھ دن بعد شاہی حکم سے جرمانہ بھی معاف ہو گیا۔ اور ۱۶۲۷ء میں پوری طرح عفو و تقصیر ہو کر پھر پارلیمنٹ میں طلبی ہوئی۔ لیکن شرم و امنگیں تھیں۔ بیکن نے حاضری کی جرأت نہ کی۔ گورنمنٹ کی طرف سے ۱۲ سو پونڈ سالانہ پنشن بھی مقرر ہو گئی۔ تاکہ بقیہ زندگی آرام سے بسر کر سکے * اب پھر لارڈ بیکن علمی مشاغل پر متوجہ ہوا۔ معلوم نہیں پہلے کس منحوس گھڑی میں اس نے یہ شغل چھوڑا تھا۔ دوبارہ قضیہ و تالیف میں مشغول ہونے کا پہلا نتیجہ ایک تاریخ ہنری ہفتم کے عہد کی تھی لیکن نے بادشاہ کی فرمائش سے یہ کتاب لکھی۔

اور اس میں شک نہیں کہ بڑی قابلیت سے لکھی -
 ہنری جیسے پُر از عیوب بادشاہ کی تاریخ لکھنا اور اس
 کے عیوب پر پردہ ڈال سکنا مشکل کام تھا۔ بیکن نے
 بڑی محنت سے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے ممدوح
 کی خرابیاں پوشیدہ کرے لیکن تاویلیں اور بناوٹی دلیلیں
 کبھی صداقت کو چھپا نہیں سکتی ہیں۔ اور نہ ان سے
 کام چلا ہے۔ دوسری تصنیف اخلاقی مضامین کا مجموعہ
 تھا۔ یہ پہلی کتاب سے بڑا تھا۔ اور بیکن نے اپنی
 اخیر عمر میں اس کو مزید اضافہ کے ساتھ دو مرتبہ شائع
 کیا۔ ایک بار انگریزی میں اور دوبارہ لاطینی زبان میں۔
 بیکن کا کمال انشا پردازی یہ تھا کہ اس کے قلم سے
 خشک مضامین بھی دلچسپ ہو کر نکلتے تھے یہ

لارڈ بیکن دولت کی طرف سے ہمیشہ لاپرواہ رہا -
 رشوت میں جو کچھ کماتا سب نوکر چاکر کھا جلتے تھے۔
 خانہ نشینی کے بعد آمدنی صرف ڈھائی ہزار پونڈ رہ گئی
 اور خرچ بدستور سابق۔ اس لئے تنگی سے بسر ہوتی
 تھی۔ علاقہ کفول و قرض کے بار میں دبا ہوا تھا۔
 پشن وقت پر نہیں ملتی تھی۔ ۱۵۳۹ء میں جیمس اول
 فوت ہو گیا۔ اور چارلس اول تخت نشین ہوا۔ بکنگھم
 اس پر بھی قابو یافتہ تھا۔ چارلس اول میں ذاتی لیاقت
 خاک نہ تھی۔ وہ کسی فلسفی کی قدر کہاں سے کرتا -
 بیکن نے نئے بادشاہ سے امداد کی درخواست کی۔ مگر اس
 کو جواب نہ ملا۔ مصائب اور ذلتوں نے نڈھال کر دیا تھا۔

سن کی زیادتی - قرض - اور رنج و غم نے اس کو بالکل تھڑ مروڑ ڈالا اور بیکن بیمار پڑ گیا۔ آب و ہوا بدلنے کی غرض سے ہائی گیٹ کو اپنے دوست ڈیوک آف ارنڈل کے یہاں جا رہا تھا۔ راستہ میں یہ خیال سوچا کہ حیوانی جسم کے برف کے ذریعے سڑنے سے محفوظ رہنے کا تجربہ کرے۔ ابتدائی موسم بہار کا زمانہ تھا۔ اور نہایت سرد دن - چاروں جانب برف کے ڈھیر لگے تھے۔ سرد ہوا تیز تیز چلتی اور جگہ میں سرایت کرتی تھی۔ بہادر فلسفی نے برف کے اندر ایک غریب کسان کا جھونپڑا دیکھ کر گاڑی رکوا دی۔ اتر کر برف میں چلتا ہوا جھونپڑے تک گیا اور ایک مرغی خرید کر اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر اس میں برف بھرنے لگا۔ ابھی یہ کام ختم نہیں ہوا تھا کہ سردی نے بے قابو بنا دیا اور ایسی طبیعت بگڑی کہ ڈیوک کے گھر تک بمشکل پہنچا۔ جہاں صرت ایک ہفتہ کی بیماری کے بعد یہ فلسفہ کا تیسرا معلم اور حکمت مادّیہ کا موجد ۹ اپریل ۱۹۲۶ء کو ۶۶ برس کی عمر میں دُنیا سے چل بسا۔ افسوس!

بیکن جس نے ذوق تجربہ میں ایک علمی مسئلہ کی تحقیقات پر جان قربان کر دی سچا علمی شہید ہے۔ وہ سینٹ میکائیل کے گرجہ واقع سینٹ الہن میں اپنی ماں کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ سرطاس سینٹیز اس کے سکڑی نے ایک سادہ سنگ مرمر کا کتبہ بطور

یادگار اس کی قبر پر لگا دیا ہے جو آج تک اس بے
مثل فیلسوف کا نشان بتاتا ہے۔ بیکن کی بی بی اس
کی وفات سے بیس سال قبل مر چکی تھی۔ اس نے
کوئی اولاد اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ بیکن نے اپنے
کا پتے ہونے لگتے سے جو آخری خط اس دنیا میں لکھا
تھا۔ اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ ”برٹ والا تجربہ
بہت عجیب اُترا“ اور ہم بھی اس امر سے یہ سمجھ
سکتے ہیں کہ بیکن کی جان کامیابی کی سسرت سے ہمکنار
ہو کر قالب سے جدا ہوئی ہوگی +

یہ عجیب بات ہے کہ بیکن جیسا کامیاب فیلسوف
بیرسٹر اور رئیس مرا تو اس حالت میں کہ شخص کے
لئے ٹکا پاس نہ تھا۔ اس کی وجہ یقیناً اس کی فیاضی
اور دولت سے بے مثل نفرت تھی +

بیکن کے مختصر حالات آپ نے پڑھ لئے ہیں۔ اس
کی خوبیوں اور عیوب پر آپ کی نظر محیط ہو چکی ہے۔
جب ایک طرف اس کے روشن علمی کارنامے اسے مکمل
انسان کے لباس میں جلوہ گر کرتے ہیں۔ تو دوسری
جانب انسانی کمزوریاں اس کی بد اخلاق و کمینہ
خصلت بھی دکھا رہی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہم
اس کے علم و کمال سے فائدہ اُٹھاتے اور اُٹھا سکتے
ہیں۔ اور اس کی اخلاقی کمزوریاں ہمیں کوئی نقصان
نہیں پہنچا سکتیں۔ علاوہ بریں اس کے علم و فضل
سے نفع اُٹھانے والوں کی تعداد زیادہ اور اس کی

بدی کے ضرر رسیدہ بیکر قلیل ہیں۔ پھر وہ بُرائیاں
اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو چکی ہیں۔ اور اس
کی دماغی قابلیت سے فیض پانے کا دروازہ ابد الابد
تک کھلا ہوا رہیگا۔ اس لئے ہم بیکن کو بُرا نہیں کہہ
سکتے اور بہر حال اس کے علمی اعمال کی تعریف کرنا ہمارا
فرض ہے۔

بیکن کہتا ہے کہ جب تک تجربہ اور مشاہدہ کی
کسوٹی پر کس بات کو نہ کسا جائے اُس وقت تک وہ صحیح
نہیں ہوتی اور اُس کا جاننا علم نہیں کہا جاسکتا۔ اور
کسی شے کا پورا اور پختہ یقین حاصل کئے بغیر اس سے
آگے بڑھنا ٹھیک نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہر چیز کے
متعلق واقعات کی اچھی طرح جانچ اور تشریح کر لی جائے
اور اُس کو علمی طور پر آزما لیا جائے کہ وہ کس طرح پر
عمل یا اثر کیا کرتی ہے۔ مثلاً گرمی اور حرارت کا اندازہ
کرنا اور اس کے اثر اور عمل کا پتا لگانا ہو تو آفتاب
اور آگ کی گرمی کو چند معمولی تجربوں کے بعد ہی باطنیان
مان لینا درست نہیں بلکہ ہر طرح سے ان کا آزمانا شرط
ہے۔ یعنی آفتاب کی شعاعوں کو دونوں طرح پر جانچا جائے۔
براہ راست آفتاب سے آنے والی شعاعوں کا الگ اور
دوسری چیز میں منعکس ہو کر آنے والی کرنوں کا جداگانہ
تجربہ کیا جائے۔ اور اسی طریقے پر بجلی - ٹوٹنے والے
ستاروں - آتش فشاں پہاڑوں اور تمام دوسری قسم کی
حرارتوں کا الگ الگ تجربہ کرنا ضروری ہے ایسے ہی

ٹھوس چیزوں کی گرمی - گرم چشموں کی حرارت - رقیق کھولتی ہوئی چیزوں اور بھاپ کی گرمی - حرارت قائم رکھنے اور اس کو خارج نہ ہونے دینے والے اجسام کی گرمی جیسے کہ اُون اور سمور وغیرہ - اور اُن چیزوں کی حرارت جن میں رگڑ سے گرمی پیدا ہوتی ہے - اور حرارت سے پیدا کی گئی ترگھاس وغیرہ اور دیگر حرارتوں کے مخرج کا تجربہ مکمل کر لینے کے بعد اور ان کے اسباب پر کامل واقفیت ہم پہنچا کر تم حرارت کی تعریف - اس کی قسمیں - اور اس کی ماہیت و خاصیت کا بیان کرو اور شوق سے اس کے متعلق قواعد بناؤ *

اگرچہ کوپر ینگس - ٹانچو براہی اور دیگر فیلسوفوں اور ماہران علم طبیعیات نے بھی یہی رائے پیش کی تھی جو بیکن نے ظاہر کی - لیکن وہ لوگ علی پہلو پر اس قدر زور نہیں دے سکے - بیکن ہی وہ شخص تھا جس نے علی سائنس کو ترقی دی اور اس کے اصول منضبط کئے - لہذا بیکن کو جدید سائنس و طبیعیات کا بانی کہنا بالکل حق بجانب ہے *



آئزک نیوٹن

یہ نامور فیلسوف "کشش مرکز ثقل" کے مسئلہ کا موجد اور علم ریاضیات میں بہت بڑا ماہر تھا -

انگلستان کے ضلع لنگو شائر میں بشہر گرینٹھم کے قریب ایک موضع دوستھورپ نامی ہے۔ یہیں ۱۶۴۲ء میں آئزک نیوٹن پیدا ہوا۔ وہ ہوش سنبھالنے کی عمر میں اسکول میں داخل ہوا لیکن اس کی تندرستی اس قدر نازک تھی کہ اچھی طرح لکھنے پڑھنے میں محنت نہیں کر سکتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کا دور کچھ اسی طرح کی لاپرواہی میں گزر گیا اور اب وہ علوم و فنون کے مطالعہ اور درس کی حد میں داخل ہوا تو علم کا شوق خود بخود دل میں گھر کر گیا۔ اب تو آئزک نیوٹن سے بڑھ کر محنتی اور شائق کوئی طالب علم نہ رہا۔ وہ جماعت میں تمام ساتھیوں سے بڑھا رہتا اور چھٹی کے وقت جبکہ دوسرے طلبہ کھیلتے کودتے رہتے تھے۔ نیوٹن چھوٹی کلیں بنایا کرتا اور اسی کو اپنی تفریح کا مشغلہ سمجھتا۔ اسی زمانہ میں نیوٹن نے کئی عجیب و غریب کھلونے تیار کئے ایک گھڑی بنائی جو پانی کے ذریعے سے چلتی تھی۔ ایک کل تیار کی جس کو چوہا گردش دے کر حرکت میں لایا کرتا تھا۔ ایک گاڑی اس قسم کی تیار کی جس پر ایک آدمی سوار ہو کر اسے بائیسکل کی طرح پیروں سے چلاتا +

پندرہ سال کی عمر میں نیوٹن کی والدہ نے اس کو مدرسہ سے اٹھا کر کاشتکاری کے کام پر لگایا۔ مگر جس کو علم کا مذاق ہو وہ کب اس کے حصول سے باز رہ سکتا ہے۔ نیوٹن کھیتی باڑی کے کام سے فرصت

پاکر برابر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اس کی یہ حالت کہیں اس کے ماموں نے دیکھی اور وہ سمجھا کہ یہ بچہ ہونہار ہے۔ مبادا خلافتِ طبیعت کام میں پھنسے رہنے سے اس کا جوشِ حصولِ علم ٹھنڈا پڑ جائے تو یہ کسی طرف کا نہ ہوگا۔ لہذا اس نے اپنی بہن یعنی نیوٹن کی ماں کو سمجھا بھجا کر آئزک نیوٹن کو دوبارہ مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ آئزک نیوٹن کچھ ہی عرصہ میں علمِ ریاضی کا ایک مشہور عالم ہو گیا۔ اور ۱۶۶۶ء میں وہ کیمبرج کے ٹرینیٹی کالج کا فیلو مقرر ہوا۔

۱۶۶۶ء سے آئزک نیوٹن کی توجہ ریاضی کے بعض باریک مسائل پر ہو چکی تھی اور وہ ہمہ تن ان کے دریافت کرنے میں کوشش کرتا تھا۔ وہ فلک‌شنسز (Fluxions) یا ڈفرینشل کالکلس (Differential Calculus) یعنی کلیاتِ وجوہات کے حساب کا طریقہ معلوم کرنے اور روشنی۔ رنگ اور کششِ مرکزِ ثقل کے اکتشاف میں سرگرم تھا۔ جبکہ وہ اسی سال ایک دن علمِ ریاضی کا مطالعہ کر رہا تھا یکایک اس کے دل میں خیال آیا کہ چاند زمین کے گرد اور دیگر ستارے آفتاب کے گرد ہمیشہ کیوں گردش کرتے رہتے ہیں؟ قدرتی قاعدہ تو یہ ہے کہ ہر چیز کی حرکت خطِ مستقیم میں ہو۔ اگر ہم ایک پتھر لے کر پختہ فرش یا سطح

مینر پر لڑھکا دیں تو جس وقت تک ہوا یا خود فرش
 اور مینر مئی نا موزوں سطح اس کو نہ روکے وہ برابر خط
 مستقیم میں حرکت کرتا اور لڑھکتا چلا جائیگا۔ پس کیا
 وجہ ہے کہ اجرام فلکی دوری حرکت کرتے یعنی لگاتار
 اپنے دائروں ہی کے اندر چلتے رہتے ہیں ؟
 آئزک نیوٹن اسی طرح سوچ میں تھا اور ابھی اس
 نے کوئی رائے اس مسئلہ پر قائم نہیں کی تھی کہ
 کیمرج میں وبا نمودار ہوئی اور وہ اپنے وطن کو
 چلا گیا۔ گھر پر جا کر اس کا زیادہ وقت اپنے مزرعہ
 اور باغ کی دیکھ بھال میں صرف ہونے لگا اور اس
 حالت میں بھی اس کو جس بات کی موصن لگی تھی وہ
 ہر وقت اس کے دماغ میں بسی رہتی۔ آئزک خواہ
 کسی کام میں مصروف ہوتا لیکن اس کا دماغ فکر سے
 رنجلا نہ بیٹھتا۔ آخر ایک دن اسی غور و خوض کے عالم
 میں وہ ایک باغ میں جا بیٹھا۔ آئزک اپنے خیال
 میں ڈوبا تھا کہ یکایک کسی آواز نے اسے اپنی طرف
 متوجہ کر لیا۔ یہ آواز کیسی تھی ؟ اس کے قریب ہی
 سیب کے درخت سے ایک پختہ سیب ٹوٹ کر زمین
 پر گرا تھا اور اس کی صدا نے آئزک کو اپنی جانب
 مائل کر لیا۔ آئزک کا دماغ معاً چونک پڑا اور
 اس کے دل میں خیال آیا کہ ”سیب شاخ سے ٹوٹ
 کر زمین پر کیوں گرا؟“ اس نے تھوڑے سے
 غور کے بعد خود ہی یہ جواب بھی دیا۔ کہ ”زمین

کی کشش سیب کو اپنی طرف کھینچ لائی ہے۔
اس وقت جو بات آئزک نیوٹن نے معلوم کی
یہ کوئی نئی بات نہ تھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے
بھی بہت سے لوگوں کو یہ خیال آیا ہو اور ضرور
آیا ہوگا۔ مگر جو فائدہ اس تصور سے آئزک نیوٹن نے
اخذ کیا وہ اوروں کو نہیں سوجھا تھا۔ نیوٹن نے اس
تصور پر عقل دوڑانا شروع کیا اور بہت غور و خوض
کے بعد وہ یہ رائے قائم کر سکا کہ اگر زمین کی کشش
سے پھل زمین پر گرا ہے تو یقیناً ماہتاب کو بھی
زمین ہی کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہوگی
اور ایسے ہی زمین اور دیگر آسمانی اجرام اور کشش
مرکز ثقل ہی کے سبب آفتاب کے گرد گھومتے رہتے
ہیں۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ اگر تم ایک گیند ڈورے میں
باندھ کر اپنے گرد پھراؤ تو جب تک ڈورے کو ڈھیلا
نہ چھوڑو گے وہ گیند برابر تمہارے گرد گھومتی رہیگی۔
اور جوہنی ڈورا ڈھیلا ہوا بس وہ ایک طرف سیدھی
چلی جائیگی۔ اسی اصول پر قوت کشش ثقل آسمانی
اجرام کو آفتاب کے گرد روکے ہوئے گردش دے
رہی ہے۔

یہ خیال قائم کرنے کے بعد نیوٹن کی توجہ اس
طرف مائل ہوئی کہ اس علمی نظریہ کو عملی جامہ بھی
پہنائے۔ وہ زمین اور چاند کا بعد دریافت کرنے

میں مصروف ہوا۔ لیکن ناکام ہوا۔ آخر اسے پتا چلا کہ
 فرانس کے فیلسوف پکارٹ نے زمین سے ماہتاب کا
 فاصلہ اور زمین کی جسامت دریافت کر لی ہے۔ نیوٹن
 نے اُس کا حساب معلوم کیا اور پھر خود جانچ کر اس
 کی صحت آزمائی یعنی اس پر ثابت ہو گیا کہ واقعی
 چاند کی حرکت زمین کی کشش کے مطابق ہے *
 کشش مرکز ثقل کیا چیز ہے؟ یہ وہ قوت ہے
 جس کے ذریعے سے چیز ہر دوسری چیز کو اپنی جانب
 کھینچتی رہتی ہے۔ زمین پر جتنی چیزیں ہیں ان کے
 اپنی اپنی جگہ پر قائم اور رُکی رہنے کا راز یہی کشش
 ثقل ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ گر کر ٹرٹھکتی پھریں اور
 انسان زمین سے اُڑ کر خلا میں پرواز کرنے لگے *
 اجرام فلکی میں سے ہر ایک دوسرے جرم کو اپنی
 طرف جذب کرتا رہتا ہے اور چونکہ وہ خلا میں نہایت
 تیزی کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اس واسطے
 ایک دوسرے پر نہیں گرتے اور نہ آپس میں ٹکراتے
 ہیں۔ بلکہ بڑے اجرام کی کشش کے باعث چھوٹے
 اجرام ان کے گرد گھومتے اور چکر کاٹتے رہتے ہیں۔
 اور آفتاب جو تمام اجرام سے ۱۰ گنا بڑا ہے وہ
 سب کو اپنے گرد دُور میں رکھتا ہے۔ اور اسی
 وجہ سے وہ نیر اعظم کہلاتا ہے اور اس کا یہ نظام
 نظام شمسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے *
 آئزک نیوٹن نے بڑی دماغ سوزی کر کے

ککش ثقل کا حساب تیار کیا اور یہ بتایا کہ کیونکر چھوٹے اجرام آفتاب کے گرد ایک مقررہ فاصلے پر گھومتے اور ککش کے ذریعے اس سے مل نہیں جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے پتا چلایا کہ آفتاب و ماہتاب کی قوت کشش ہی سمندروں میں جوار بھاٹا لاتی ہے۔ زمین بالکل گول یا مدور نہیں بلکہ وہ قطبین پر چپٹی اور خط استوا پر ابھری ہوئی ہے۔ تقویم منطقۃ البروج یعنی موسم بہار و موسم خزاں کا اعتدال کب واقع ہوتا۔ اور جاڑے اور گرمی کی فصلوں میں کب دن اور رات برابر ہو جاتے ہیں *۔



فہرست کتب مؤلفہ مولوی عبداللہ خاں

راقم کی تصنیف کی ہوئی کتابیں طالب علموں اور عام شائقین کے واسطے نہایت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ جناب ڈاکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب نے سلسلہ حساب کی کتابوں اور نیز گلہ شہ مضامین کو بموجب سرکلر نمبر ۷۱ مورخہ ۶ فروری ۱۹۱۸ء ٹیکسٹ بک مقرر کیا ہے۔ کل کتا ہیں نئی سکیم کے مطابق ہیں جو آج کل رائج ہے۔ ہر ایک کتاب کا نام اور اس کی مختصر کیفیت ذیل میں درج ہے جن صاحبوں کو ازراہ قدر دانی منگانی ہوں ایک کارڈ بھیج کر بذریعہ دی پی پارسل خواہ راقم سے یا تاجران سب سے جن کے نام نامی اس اشتہار کے آخر میں درج ہیں منگالیں۔ زیادہ کتابوں کی خریداری پر معقول کیشن دیا جاتا ہے۔ جس کا فیصلہ بذریعہ تحریر ہو سکتا ہے۔ گلہ شہ مضامین حقہ دوم بھی داخل فہرست سررشتہ تعلیم ہے +

نوٹ۔ کتابوں کا آرڈر دینے میں ہمت احتیاط کرنی چاہئے۔ بعض کتابیں صرف درنیکر سکولوں کے لئے ہیں اور بعض صرف انگلو درنیکر سکولوں کے لئے اور بعض دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ سلسلہ حساب نمبر ۱ سے ۴ تک درنیکر اور انگلو درنیکر سکولوں کے لئے یکساں ہیں۔ نمبر ۵ دونوں قسم کے سکولوں کے لئے یکساں ہے۔ لیکن درنیکر سکولوں کے لئے ایک ضخیمہ علاوہ کتاب کے صرف ایک آنہ (۱۰) فیسٹ بر دیا جاتا ہے۔ نمبر ۶ اور ۷ درنیکر اور انگلو درنیکر سکولوں کے لئے جدا جدا ہیں +

راقت

عبداللہ خاں

سابق سیکنڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل سکول، دیرون سوچی، دروازہ ۱، لاہور

حساب کی کتابیں اردو میں

- ۱۔ سلسلہ حساب نمبر ۱۔ پہلی جماعت کے لئے : تصدیق اور مختلف قسم کی شکلوں کے ذریعے ایک سے ۱۰ تک گنتی سکھانے کی بے نظیر کتاب ۱۰ × ۱۰ کے پھاڑے۔ چودہ عددوں کی جمع و تفریق بھی درج ہے۔ قیمت ۲ روپوں۔
- ۲۔ سلسلہ حساب نمبر ۲۔ دوسری جماعت کے لئے : قاعدہ۔ ۶ عدد۔

(۱) گنتی ۱۰۰۰۰۰ ایک - سادی جمع و تفریق - پہاڑے ۱۴ x ۱۴ - چھوٹی ضرب و تقسیم

سادہ جس میں مضروب فیہ یا مقسوم علیہ ۱۴ سے زیادہ نہ ہو چار چار و چار و چار کا
تقسیم شکلوں اور اعداد مقرون کے ذریعے - قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰

۳ - سلسلہ حساب نمبر ۳ - تیسری جماعت کے لئے - قاعدے کے لئے
لہجی ضرب و تقسیم سادہ - کمسوری پہاڑے ۱۴ x ۲۰ و ۲۰ x ۲۰ مع شقی سوالات -

دیسی نقدی کے پیمانے - تحویل - جمع و تفریق مرکب - قیمت ۲۰ محصول ۱۰۰
۴ - سلسلہ حساب نمبر ۴ - چوتھی جماعت کے لئے - قاعدے کے لئے -

ضرب و تقسیم مرکب - وزن لمبائی اور وقت وغیرہ کے پیمانے - تحویل - اجزائے ضربی
اعداد مفرد و مرکب - عاد اعظم و ذوا صغاف اقل - کمسور عام کے قاعدے (کمسور ملکت)

و مسلسل کے سوا) کمسوری پہاڑے ۲۰ x ۲۰ و ۲۰ x ۲۰ و ۲۰ x ۲۰ مع شقی
سوالات - مہاجنی ہندسہ (صرف ورنیکلر سکولوں کے لئے) قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰

۵ - سلسلہ حساب نمبر ۵ - پانچویں جماعت کے لئے - قاعدے کے لئے -
اکائی کے قاعدے سے سوالوں کے حل کرنے کا طریق - تجارت مفرد - سود مفرد - سطحات

پھیلاؤ - قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰
ضمیمہ { صرف ورنیکلر سکولوں کے لئے - قاعدے کے لئے - دیسی طریقہ

۶ - سلسلہ حساب نمبر ۶ - حساب بھی کھاتا - قیمت ۱۰۰ محصول ۱۰۰
۷ - سلسلہ حساب نمبر ۷ - ورنیکلر ڈل سکولوں کی پہلی جماعت کے لئے -

قاعدے کے لئے - تجارت مرکب - کمسور ملکت و مسلسل - کمسور اعشاریہ - سود کے سوالوں
میں اصل ذریعہ اور مدت دریافت کرنا - قیمت ۲۰ محصول ۱۰۰

۸ - سلسلہ حساب نمبر ۸ - انگلو ورنیکلر ڈل سکولوں کی پہلی جماعت
کے لئے - قاعدے کے لئے - کمسور ملکت و مسلسل - تول باب وغیرہ کے انگریزی پیمانے

میٹری پیمانے - کمسور اعشاریہ - اوسط - فیصدی - سود کے سوالوں میں اصل ذر
شرح اور مدت دریافت کرنا - قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰

۹ - سلسلہ حساب نمبر ۹ - ورنیکلر ڈل سکولوں کی دوسری جماعت
کے لئے - قاعدے کے لئے - اوسط - فیصدی - وقت اور کام - نفع نقصان تناسب

تقسیم بہ اجزائے متناسب - جذر - قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰
۱۰ - سلسلہ حساب نمبر ۱۰ - انگلو ورنیکلر ڈل سکولوں کی دوسری

جماعت کے لئے - قاعدے کے لئے - حرفی حساب - حروں کی قیمت ہندسوں میں
مساوات درجہ اول جس میں صرف بیچ عدد ہوں بغیر عبارتی سوالوں کے - تجارت مرکب

کام اور وقت - نفع نقصان - (الف + ب) کی توضیح شکلوں کے ذریعے تقسیم
بہ اجزائے متناسب - قیمت ۵۰ محصول ۱۰۰

۱۰ - سلسلہ حساب نمبر ۱۰ - ورنیکلر ڈل سکولوں کی تیسری جماعت

کے لئے - قاعدے :- محاسبات - قیمت نقد و منی کا ٹاپا - سود مرکب - پچھلے
 قاعدوں کی مشق - قیمت ۶ - محصول ۱۰
 ۱۱ - حساب کا پہلا حصہ - اس حصے میں چاروں ابتدائی قاعدے مفرد و
 انجیب نئی طرز پر لکھے ہیں - قیمت ۴ - محصول ۱۰
 ۱۲ - حساب کے جدید سوالات مع حل - حساب کے مشکل سے مشکل
 سوالوں کو اپنے آسان طریق سے حل کر کے دکھایا ہے کہ جس شخص کو معمولی حساب
 بھی آتا ہو وہ اس کتاب کو پڑھ کر پورا محاسب بن سکتا ہے - اردو میں ایسی کتاب
 اس فن میں اب تک نہیں لکھی گئی - قیمت ۵ - محصول ۱۰
 نوٹ - مذکورہ بالا کتابیں پٹواریوں کا امتحان دینے والوں کے لئے بھی نہایت
 مفید ہیں +

حساب کی کتابیں انگریزی میں

۱۳ - اکسر سائزران ارتھیٹک - یہ کتاب انگلو دریکٹر ڈل -
 انٹرنس - ایف اے - کراؤننگ کالج اور امیدواران امتحان مقابلہ اکسٹرا اسٹوڈنٹ
 ورڈز کالج کے لئے از حد مفید ہے - قیمت ۸ - محصول ۱۰
 ۱۴ - اکسر سائزران منسوریشن - یہ کتاب امیدواران امتحان ڈل
 انٹرنس ورڈز کالج کے لئے نہایت مفید ہے - قیمت ۶ - محصول ۱۰
 ۱۵ - ڈیفینیشنز آف ارتھیٹک - یہ کتاب ڈل و انٹرنس کے لئے مفید
 ہے - قیمت ۲ - محصول ۱۰
 ۱۶ - فارمولی ان منسوریشن - یہ کتاب بھی ڈل اور انٹرنس کے طلباء
 کے لئے نہایت مفید ہے - ساحت کے تمام قاعدوں کو ایک جگہ نہایت مختصر
 طریق سے جمع کیا ہے - قیمت ۱۰ - محصول ۱۰

اردو کی کتابیں

۱۷ - گلدستہ مضامین حصہ اول - اپر پرائمری کی پانچویں جماعت کے
 لئے - بچوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانے اور ان کی عام معلومات بڑھانے کے
 لئے ہے - مشق کتاب - قیمت ۴ - محصول ۱۰
 ۱۸ - گلدستہ مضامین حصہ دوم - ڈل سکول کے طلباء کے لئے تنظیم
 کتاب - طلباء کو مضامین نویسی سکھانے - ان کی عام یاقوت بڑھانے اور ان کے
 دلوں میں اخلاقی جوہر پیدا کرنے کے لئے بہترین کتاب - قیمت ۶ - محصول ۱۰
 ۱۹ - گلدستہ مضامین حصہ سوم - انٹرنس کے طلباء کے لئے لایا گیا

ایجنٹ جن کے پاس سے مذکورہ بالا کتاب

لا در مولوی عبدالغفار سابق سینڈ ماسٹر نٹل
 ماڈل سکول منیجر برکت ایجنسی موجید وارہ لاہور
 حاجی چراغ الدین سلج الدین - شیخ غلام علی اینڈ سنز
 لاہور چند کپور اینڈ سنز - لاہور لال سوری -
 جے - ایس سنت سنگھ اینڈ سنز
 امرتسر - لال دیو داس اینڈ سنز بازار مائی سیواں
 ولی - ماسٹر گر دھاری لال بازار چرخ والا -
 منیجر اسپرٹل بک ڈپو کرشن لال نرائن داس -
 کارونیش بک ڈپو
 ہوشیار پور - لال ہیرالعل اینڈ سنز
 جالندھر - پالال بھول بازار شیخاں -
 روپال دلال چند نواں شہر
 گجرات - الہی بخش رحیم بخش
 سیالکوٹ منشی نوالہ بین منشی بہادر چند
 پشاور - دیوان وزیر سنگھ اینڈ سنز - چھو سنگھ
 جیون سنگھ - رام سرن اینڈ برادرز - حاجی محمد
 عبدالرحمن حضور پشاور
 لدھیانہ - بہرام رام چند شیخ الہی بخش
 رائل پور - زبیر دیو راجا رام
 منٹگری - جگن ناتھ اینڈ سنز عالیستان
 بک ڈپو کمالیہ
 ملتان - کاظم علی غلام مہر

فیروز پور - لاہور
 ہنسراج
 پیالہ سیٹ -
 انبالہ - لالہ نند
 راولپنڈی -
 پنڈت بھاگل مل
 میانوالی - رو
 یگھراج مہران
 گوجرانوالہ - پنڈت
 ڈیرہ غازیخان -
 ڈیرہ اسماعیل خان
 جلم - لہو ترا برادرز
 جموں - جے رام دا
 گورداسپور - لال جیٹھو
 حیدر آباد کن - سید
 محمد میراں - احمد حسین جعفر
 مدراس - بی رمیا اینڈ
 میسرٹھ - کدرا ناتھ اینڈ سنز
 آگرہ - سنگھ برادرز
 کوٹہ - مفتی سمیع اللہ
 سورت - کرشن داس نرائن
 بھڑوچ - ماسٹر گوردھن داس

ری ۱۹۱۱ء
اقتباس

مرکز نمبر (۲)

نمبر سلسلہ ۷۰۲

نزیل جے سی گاڈلے صاحبہ اور ایم اے

ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب

نرصابان انپکنگ آفیسرز (افسران معاشقہ) و ہیڈ ماسٹرز
سرکاری و امدادی ورگنگناٹز و غیر امدادی صوبہ پنجاب

ب۔ ٹولفہ مولوی عبداللہ خاں سابق سیکنڈ ماسٹر جنرل لڈل
بلڈ ماسٹر سرکاری و امدادی ورگنگناٹز و غیر امدادی ماس
الٹرنیٹو (بالمقابل) ٹکسٹ بک مقرر کیا جاتا ہے یعنی
ہاں چاہیں وہ خواہ ان کتابوں کو پڑھائیں یا ان کتابوں
سے پڑھائی جاتی ہیں :-

نہ مضامین حصہ اول - ساتویں اور آٹھویں کتاب کی جگہ
رشتہ مضامین حصہ دوم - (سرکر نمبر ۷۰۲ سلسلہ ۷۰۲)
سلسلہ حساب نمبر الغایت ۸ - مروجہ کتاب حاکم خل فہرست کی جگہ
خط آنریبل جے سی گاڈلے صاحبہ اور ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب

